سابق پرنسپل گورنمنٹ طبی کالج کا پیش لفظ بھی پڑھنے کے لائق ہے، مصنف کے ایک ہم وطن نے ان کا تعارف کرایا ہے، مگر اس کی زبان و بیان میں ناہمواری ہے، ص ۱۹۵ پر ۱۳۹۶ھ کا مطابق سنہ عیسوی ۱۹۲۷ء دیا ہے جو غلط ہے، صحیح ۱۹۷۶ء ہے، ص ۲۸۳ پر مولانا احمد علی لاہوری کا نام غلطی سے مولانا محمد علی لاہوری لکھا ہے، موخر الذکر قادیانی تھے، اور اول الذکر مولانا عبید اللہ سندھی کے مایۂ ناز شاگرد اور انجمن خدام الدین لاہور کے امیر تھے، ابن خلکان کا املا ابن خلقان اور ... مرضی کا مرضا لکھا ہے۔

ہند و پاک میں عربی ادب: مرتبہ مولوی اقبال احمد سلفی صاحب، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۴۴، قیمت آٹھ روپیے پتہ :- محمد اسلام بک سیلر، نوگڑھ بستی

عربی زبان و ادب کی خدمت میں ہندوستان کے علماء و مصنفین کے کارنامے بڑے اہم ہیں، اس کتاب میں دوسری صدی کے آخر سے اب تک کے وفات پانے والے ڈیڑھ سو عربی زبان و ادب کے ہندوستانی شعراء و مصنفین کا تذکرہ درج ہے، اور بعض کے کلام کا نمونہ بھی دیا ہے، یہ مصنف کی پہلی کتاب ہے، ابھی ان کو اس موضوع پر مزید تحقیق جاری رکھنی چاہیے، تاکہ دوسرا ایڈیشن زیادہ بہتر ہو سکے، ایک مبتدی کا ایسے اہم موضوع پر کام کرنے کا حوصلہ قابل داد ہے۔

کانٹوں کی خوشبو: از جناب فیروز ظفر بدایونی صاحب تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۴۴ مجلد مع گرد پوش قیمت ۱۵ روپیے، پتہ :- فرشوری ٹولہ، بدایون۔

جناب محمد فیروز فرشوری بدایون کے نوجوان اور ہونہار شاعر ہیں، اس مجموعہ سے ان کے اچھے شعری ذوق اور غزل، نظم اور قطعہ نگاری وغیرہ پر یکساں دسترس کا اندازہ ہوتا ہے، ان کی غزلوں میں عشق و محبت کے جذبات کی گرمی بھی ہے اور گرد و پیش کے معاشرتی و سیاسی حالات کی ترجمانی بھی، ابتدا میں ایک نعت ہے مگر نعت گوئی مشکل صنف سخن ہے، ع با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار۔ اس کے ایک شعر میں آنحضرتؐ کو مختار کل کہا گیا ہے، جو خدا کی خاص صفت ہے، اگر سلامت روی کے ساتھ مشق سخن جاری رکھی تو وہ ان شاء اللہ آیندہ ایک کامیاب شاعر ہوں گے۔

"ض"

جلد ۱۳۶ ماہ محرم الحرام سنہ ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ ستمبر سنہ ۱۹۸۵ء عدد ۳

مضامین

شذرات

۴ر ستمبر سے ۶ر ستمبر ۱۹۸۵ء تک دار العلوم تاج المساجد بھوپال کی بزم سلیمانی کے زیر اہتمام حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی یاد میں ایک شاندار علمی مذاکرہ ہوا۔

اس کے عام جلسہ کی صدارت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے کی، افتتاح مصر کے سفیر محترم عمرو موسیٰ نے کیا، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر جناب ہاشم علی اختر اور وہاں کے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بھی اس میں شرکت کی، دار المصنفین کے علمی شعبہ کے تمام ارکین ایک وفد کے ساتھ شریک ہوئے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ دہلی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد، مدراس اور خود بھوپال کے بہت سے نمایندوں کی وجہ سے اس کی رونق میں بڑا اضافہ ہوا، چار روز تک قیام و طعام کا بڑا اچھا انتظام تھا، نمایندوں کو سیفیہ کالج بھوپال، جناب حفیظ اللہ خان بمبئی اسٹور، ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ، انجمن اتوار، جناب رسول احمد صدیقی وزیر حکومت مدھیہ پردیش، حضرت شاہ محمد سعید مجددی سجادہ نشین خانقاہ مجددیہ نے ایٹ ہوم اور کھانے پر مدعو کیا، جس سے مذاکرہ کی علمی ضیافت کے ساتھ کام و دہن کی لذت کا بھی پورا سامان فراہم رہا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے خطبۂ صدارت میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ پر پورا ایک فاضلانہ مقالہ پڑھا، جس میں یہ دکھایا کہ کس طرح انھوں نے قدیم و جدید رنگ میں ایک خوشگوار امتزاج پیدا کیا، خاکسار کا چھپا ہوا کلیدی مقالہ پہلے ہی تقسیم کر دیا گیا تھا، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے حضرت سید صاحبؒ کے علمی کارنامے پر ایک بہت ہی عمدہ مقالہ پیش کیا، جو ان شاء اللہ معارف میں جلد ہی شایع ہوگا، مقالات کی بہت بڑی تعداد تھی، جو مقالات پڑھے گئے ان کے حسب ذیل عنوانات اور مقالہ نگاروں کے اسمائے گرامی سے مذاکرہ کی نوعیت اور اہمیت کا اندازہ ہوگا: سید صاحبؒ کی تنقیدی بصیرت سیرۃ النبیؐ کی روشنی میں، از ڈاکٹر محمد یاسین مظہر، مسلم یونیورسٹی، سلیمانی سیرۃ النبی اور جدید عربی کتب سیرت، از ڈاکٹر

محمد راشد ندوی، مسلم یونیورسٹی، سید صاحبؒ کی تاریخ نگاری عرب و ہند کے تعلقات کی روشنی میں، از ڈاکٹر عبد الباری مسلم یونیورسٹی، سید صاحبؒ کے کچھ علمی ملفوظات از مولانا ابوالعرفان خان ندوی، ندوۃ العلماء لکھنؤ، سیرۃ النبیؐ جلد چہارم کے بعض قرآنی مباحث از مولانا ضیاء الدین اصلاحی، دار المصنفین، حضرت سید صاحبؒ اور کتابوں پر مقدمات، از ڈاکٹر مشیر الحق ندوی، جامعہ ملیہ، سید صاحبؒ کی اردو شاعری، از جناب سید خاں صاحب بھوپال، سید صاحب کی عربی شاعری، از مولانا محمد رابع ندوی، ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

اور دوسرے مقالات جو پڑھے گئے وہ یہ تھے: علامہ سید سلیمان ندوی ایک محقق اور تنقید نگار، از پروفیسر محمد ابراہیم ندوی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد، علامہ سید سلیمان ندویؒ اور قرآنیات، از ڈاکٹر محمد اقبال انصاری، مسلم یونیورسٹی، سید صاحبؒ کا تنقیدی اسلوب، از جناب حبیب ریحان خان ندوی ازہری، بھوپال، سید صاحبؒ کی فقیہانہ خدمات از مولانا عبید اللہ کوٹی ندوی دار المصنفین، سید صاحبؒ کی فقیہانہ شان، از جناب محمد علی قاسمی بھوپال، حضرت سید صاحبؒ اور مستشرقین، از حافظ عمیر الصدیق ندوی، دار المصنفین، مکاتیب سلیمان کے علمی و ادبی نکات، از ڈاکٹر فضل الرحمن ندوی مسلم یونیورسٹی، مولانا سید سلیمان ندوی ایک تحریک، از ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، دہلی یونیورسٹی، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مکاتیب، از عبد اللطیف اعظمی، دہلی، سید صاحبؒ اور عربی ثقافت کی نشر و اشاعت، از ڈاکٹر محمد شفیق ندوی، جامعہ ملیہ دہلی، سید صاحبؒ اور بھوپال، از پروفیسر عبد القوی دسنوی، سیفیہ کالج بھوپال، دار القضاۃ بھوپال اور سید صاحبؒ از قاضی سید عابد علی وجدی الحسینی قاضی شہر بھوپال، سید صاحبؒ اور مولانا محمد علی جوہر از مولوی ابوالبقاء ندوی، دار المصنفین، سید صاحبؒ کے ساتھ پانچ سال، از افضل العلماء محمد یوسف کوکنی، مدراس، تحقیق الفاظ اور سید صاحبؒ، از جناب حامد حسن، سیفیہ کالج بھوپال، بہت سے اور مقالات تھے جو وقت کی کمی کی وجہ سے پڑھے نہیں گئے۔

ایک شعری نشست بھی تھی جس میں بھوپال ہی کے شعراء تھے، اس کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ جو نظمیں پڑھی گئیں وہ خالصۃً حضرت سید صاحبؒ ہی پر تھیں، جناب سید عابد علی وجدی الحسینی قاضی شہر بھوپال نے تو پورا منظوم مقالہ تحریر فرمایا تھا، جس کو انھوں نے بہت ہی موثر اور پرکیف انداز میں پڑھا۔

حضرت سید صاحبؒ کی مختلف تحریروں، خطوں، کتابوں اور دوسری چیزوں کی ایک نمائش بھی تھی، جس کو پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے بہت ہی سلیقہ سے سجایا تھا، اس کا افتتاح حضرت شاہ محمد سعید مجددی نے کیا۔

مذاکرہ کے آخر میں مختلف تجویزیں پیش کر کے منظور کی گئیں، جن میں کچھ یہ ہیں: حضرت سید صاحبؒ کے الندوہ اور معارف کے جو مضامین اب تک علٰحدہ سے شایع نہیں ہوئے ہیں ان کے مجموعے شایع کیے جائیں، سیرۃ النبی کا خلاصہ ایک جلد میں ترتیب دیا جائے، اور اس کے ترجمے مختلف زبانوں میں کیے جائیں، بھوپال کے دارالقضاۃ میں سید صاحبؒ نے جو فقہی فیصلے دیے تھے، ان کا مجموعہ شایع کیا جائے، ان کی خواہش تھی کہ ہر صوبہ میں ایک امارت شرعیہ کا ادارہ ہو، اس کی تکمیل کی جائے، مسلم یونیورسٹی اور بھوپال یونیورسٹی میں ان کے نام پر ایک چیر قائم ہو، دارالمصنفین میں ہر سال ان پر ایک توسیعی لکچر ہو، مسلم یونیورسٹی طلبہ کے نصاب کے لیے سیرۃ النبیؐ پر ایک جامع کتاب تیار کرے، جو مقالات اس مذاکرہ میں پڑھے گئے ہیں ان کا مجموعہ جلد از جلد شایع کیا جائے۔

اس تقریب کا نمایاں ترین پہلو یہ تھا کہ جناب حافظ محمد عمران خان ندوی، امیر دارالعلوم تاج المساجد اپنی علالت کے باوجود ہر موقع پر موجود رہے، وہ چلنے پھرنے سے مجبور تھے لیکن پہیہ دار کرسی پر بیٹھ کر ہر جگہ پہونچے، حتیٰ کہ اپنے عزیز مہمانوں کو رخصت کرنے کے لیے ہوائی اڈے

اور ریلوے اسٹیشن تک پہونچے، ان کی یہ خاطر داری، پھر لذیذ کھانوں کے ساتھ ان کی میزبانی کی قندیل مہمانوں کے ذہن میں برابر روشن رہے گی، ان کا پورا خاندان خصوصاً ان کے داماد ڈاکٹر مسعود الرحمٰن نے اس تقریب کو ہر طرح کامیاب بنانے میں پوری محنت و مشقت کی۔

جناب حافظ محمد عمران خان ندوی کی نگرانی میں تاج المساجد کی تعمیر برسوں سے جاری ہے، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اب اس کی تکمیل تقریبًا ہو چکی ہے، ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمان جن ناسازگار حالات سے دوچار ہیں ان میں اس مسجد کی تعمیر ایک عدیم المثال کارنامہ ہے، بنوامیہ کے عہد میں دمشق کی جامع اموی، اندلس کی مسجد قرطبہ، دہلی اور لاہور کی شاہی جامع مسجدوں کی تعمیر کے لیے تو شاہی خزانے کھلے تھے، جناب حافظ محمد عمران خان ندوی کے پاس تو کوئی سرکاری خزانہ نہیں تھا، لیکن ولید بن عبدالملک، اندلس کے عبدالرحمٰن اول اور مغل فرماں رواؤں میں شاہجہاں اور اورنگ زیب کی دینی حمیت، اولوالعزمی اور بلند حوصلگی کا خزانہ ضرور تھا، جس کے سہارے انھوں نے یہ شاندار کارنامہ انجام دے کر اپنی اخروی سرخروئی اور سربلندی کا سامان کر لیا ہے، اس مسجد کی تعمیر ہندوستانی مسلمانوں کے لیے درس ہے کہ وہ ناسازگار حالات میں بھی اپنی عملی کوشش اور مخلصانہ لگن سے بڑے سے بڑا کام انجام دے سکتے ہیں۔

بھوپال میں پروفیسر مرتضیٰ حسین فیاض حسین قریشی بڑی محبت سے ملے، اور ہسٹری آف دارالعلوم دیوبند کی دوسری جلد خاص طور پر پیش کی، وہ سیلوداد نو ساری کے رہنے والے ہیں، جناب سید محبوب رضوی صاحب نے دارالعلوم دیوبند کی دو جلدوں میں جو تاریخ لکھی ہے ان ہی کا ترجمہ جناب پروفیسر صاحب نے کیا ہے، جس سے امید ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا پورا تعارف انگریزی داں طبقہ اور بیرونی ممالک میں اچھی طرح ہو سکے گا، اس کے لیے وہ

مبارکباد کے مستحق ہیں، تاریخ نقد ادب کے نام سے ایک کتاب جناب مولانا محمد فضل الرحمن سیوانی ندوی شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی نے بھی پیش کی، یہ تہران یونیورسٹی کے ڈاکٹر عبدالحسین زرین کوب کی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے، جس میں فلسفۂ نقد، ناقدین کے اصول و مبانی، قدیم یونان، روم، مصر، عرب، ایران اور ہندوستان میں نقد ادب کی ارتقائی تاریخ، اسلامی اور مغربی نقد کے مختلف مکاتب فکر کے انتقادی رجحانات، ایرانی ادب کے جدید میلانات وغیرہ کا سیر حاصل جائزہ ہے، اس پر ڈاکٹر نذیر احمد سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی کا ایک طویل پیش لفظ تقدیم کے عنوان سے ہے جو اس ترجمہ کے مستند اور مفید ہونے کی ضمانت ہے، امید ہے کہ یہ کتاب علمی حلقہ میں شوق سے پڑھی جائے گی، بھوپال سے جذب وسلوک کے نام سے ایک علمی ڈائجسٹ بھی شایع ہوتا ہے، اس کے چیف ایڈیٹر کمرہ میں آکر برابر ملتے رہے، یہ رسالہ مسلمانوں کے مذہبی اور علمی ذوق کی تسکین کی خاطر اچھے اچھے مضامین شایع کیا کرتا ہے۔

بھوپال سے بمبئی کا بھی سفر ہوا، جو دارالمصنفین کے بہت بڑے مربی اور ہوا خواہ جناب منشی عبدالعزیز انصاری کی عیادت کے لیے تھا، وہ رعشہ کے مرض میں مبتلا ہو کر اب بہت کمزور ہوگئے ہیں، رفیق سفر جناب شوکت سلطان اور مولوی ابوالبقا ندوی بھی تھے، اتفاق سے اسی ریل گاڑی سے مولانا ابوالحسن علی ندوی نے بھی مولانا معین اللہ ندوی کے ساتھ بمبئی کا سفر کیا، جو اپنے خاص معالج سے مشورہ کے لیے وہاں پہونچے، انھوں نے بھی منشی جی کی عیادت کی، شکر ہے کہ ان کو رعشہ کی شکایت کے سوا اور ہر طرح اچھا پایا، ان کے اور ان کے فرزند ارجمند ابوصالح سلمہٗ کی بے مثال میزبانی اور خاطر داری سے چھ روز تک ہم لوگ محظوظ ہوتے رہے منشی جی ہم لوگوں کو دیکھ کر تازہ دم نظر آئے، ان کے ساتھ بڑے اچھے دن گذرے، دعا ہے

کہ ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ پوری صحت عطا فرمائیں، اور اپنی زندگی کے بقیہ دن آن بان سے اچھی طرح گذاریں، آمین ثم آمین۔

مولانا مختار احمد ندوی نے بمبئی میں ایک علمی ادارہ دارالسلفیہ کے نام سے قائم کیا ہے، اسی کے ساتھ اصلاح مساجد کے نام سے ایک تنظیم بھی ہے جس کا افتتاح مولانا ابوالحسن علی ندوی نے کیا، اس کا مقصد ملک میں اچھی مسجدیں تعمیر کرانا اور دوسری مسجدوں کی ضروریات کو پورا کرنا ہے، اس افتتاح کے موقع پر سعودی عرب کے قونصل جنرل اور بمبئی کے عرب تاجر شیخ محمد علی بکاش بھی تھے، دوسرے دن دارالسلفیہ ہی میں دن کا کھانا تھا، جس میں شہر کے اکابر اور معززین مدعو تھے، مولانا مختار احمد ندوی نے اپنی ایک تقریر میں ادارہ کے مقاصد بتائے، اس کے جواب میں خاکسار کو شکریہ ادا کرنا پڑا اور ادارہ کی کامیابی اور کامرانی کے لیے دعا گو ہوا۔

مولانا مختار احمد ندوی بمبئی کی بڑی متحرک اور جاندار شخصیت ہیں، بڑے سے بڑا کام شروع کرکے اس کو بڑی خوش سلیقگی سے پایۂ تکمیل تک پہونچا دیتے ہیں، اپنے اور کاموں کے ساتھ دارالسلفیہ کی علمی سرگرمیوں میں بڑی جان پیدا کردی ہے، اب تک امام حافظ عبداللہ کی الکتاب المصنف فی الاحادیث والآثار کی پندرہ (۱۵) جلدیں، امام ابومحمد مکی کی کتاب التبصرة فی القراءات السبعة، امام حافظ جلال الدین عبدالرحمن کی مسند ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا اور مسند ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ، ابومحمد عبداللہ کی کتاب الامثال، شیخ ابوالفیض کی جواہر الاصول فی علم حدیث الرسولؐ اور امام ابوبکر احمد کی کتاب النفقات بہت ہی عمدہ لکھائی چھپائی اور جلدوں کے ساتھ شایع کرچکے ہیں، ان کے علاوہ عربی، انگریزی اور اردو کی تقریباً ساٹھ (۶۰) مفید کتابیں بڑے آب وتاب کے ساتھ طبع کراکے علمی حلقوں میں پہونچائی ہیں، اپنی مطبوعات کا ایک سٹ دارالمصنفین کو بھی نذر کیا، جس کے لیے ہم ان کے شکر گذار ہیں، دعا ہے کہ ان کی علمی کارگذاریاں ملک وملت کے لیے ہر طرح مفید ہوں اور یہ ادارہ بااقتدار بن کر مدت مدید تک قائم رہے۔ آمین۔

بمبئی کے قیام میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ سعودی عرب کے جنرل قونصل شیخ الشبیلی کے یہاں

شام کی چائے میں شرکت کرنے کا موقع ملا، جس میں مولانا مختار احمد ندوی کے رفقاء بھی شریک ہوئے، بمبئی میں جناب مولوی محمد مستقیم اعظمی، حاجی محمد نیاز، سیٹھ منشی محمد حنیف اور سیٹھ محمد الیاس نے جس فراخ دلی سے ہم لوگوں کی خاطرداری کی اس سے وہاں کا قیام پر کیف رہا۔

بمبئی کے المطیفی ہال میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے تحفظ شریعت کے ہفتہ کا جو آغاز ۱۴ ستمبر کو ہوا اس میں بھی شرکت کی، اس کی صدارت بمبئی کی جامع مسجد کے امام نے کی، خصوصی مہمان مولانا ابوالحسن علی ندوی صدر مسلم پرسنل لا بورڈ تھے، جنھوں نے اپنی پرمغز اور ایمان پرور تقریر سے مجمع کو متاثر کیا، اس جلسہ کو جناب بنات والا ممبر پارلیمنٹ اور دوسرے مقررین نے بھی مخاطب کیا، جو جوش و خروش تحریک خلافت کے ابتدائی دور میں دیکھنے میں آیا تھا وہی اس اجتماع سے ظاہر ہو رہا تھا، اگر یہ جلسہ ہال کے بجائے کھلے میدان میں ہوتا تو شاید لاکھوں کا ہجوم ہوتا، مسلمان مطلقہ عورت کے نان نفقہ کا جو فیصلہ اور اس سلسلہ میں مشترکہ سول کوڈ کی جو تجویز سپریم کورٹ نے پیش کی ہے اس پر انتہائی ناراضگی کا اظہار کیا جا رہا تھا، مجمع میں تحفظ شریعت کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کا عہد کیا گیا، اس سے اندازہ ہوا کہ ملک اس وقت یوں ہی طرح طرح کے مسائل سے دوچار ہے، مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنا بالکل مناسب نہ تھا، جلسہ کے خاتمہ پر مسلمانوں کے احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے عزیزی ابو صالح ابن جناب منشی عبدالعزیز انصاری نے حسرت موہانی کی اس غزل کی طرف توجہ دلائی ؎

غضب ہے کہ پابند اغیار ہوکر	مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہوکر
اٹھے ہیں جفا پیشہ گانِ مہذب	ہمارے مٹانے کو تیار ہوکر
تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو	کہ ہم بھی رہیں ان سے بیزار ہوکر
کہیں صلح و نرمی سے رہ جائے دیکھو	نہ یہ عقدۂ جنگ دشوار ہوکر
وہ ہم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرت	وفا کے ہیں طالب دل آزار ہوکر

مقالات
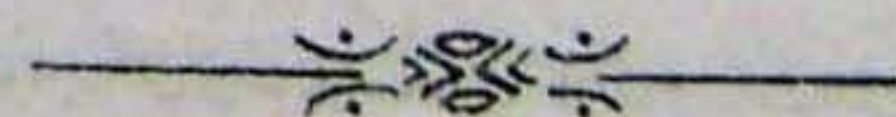
سرسید احمد خاں اور مستشرقین

از

عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دار المصنفین

(۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے متعلق کچھ روایتیں تو وہ ہیں جو قابل اعتماد نہیں اور نہ ہی وہ مذہبی روایتیں سمجھی جا سکتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے سبب اسلام نے ترقی پائی، اور مسلمانوں کو نمایاں فتوحات حاصل ہوئی گئیں، اور تمام مملکت فارس مسلمانوں کے ہاتھ پر فتح ہوئی، اور وہاں کے قدیم آتشکدے برباد ہوگئے، اور کسریٰ کے محلوں میں زلزلہ آگیا، ان واقعات کو جو بعد میں پیش آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے دن سے منسوب کر دیا گیا، اُن کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بارہ میں اور بھی روایتیں کتب سیر میں مذکور ہیں گوکہ سرسید کے بقول اُن کی صحت کے لئے بھی کافی ثبوت موجود نہیں ہے، مگر ان کے غلط ہونے کے لئے بھی کوئی دلیل نہیں ہے، مثلاً ایک روایت یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو حضرت آمنہ نے کسی کو عبدالمطلب کے پاس بھیجا اور آپ کے پیدا ہونے کی اطلاع کی، عبدالمطلب فوراً وہاں آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر کعبہ میں لے گئے، اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی،

سرولیم میور لکھتے ہیں کہ عبدالمطلب کی دعا کا جو مضمون بیان کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کے طرز کے

مطابق ہے اور اس سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ صرف مسلمانوں کی بنائی ہوئی بات ہے، مگر جیسا کہ سرسید نے لکھا ہے کہ

"ہم کو اس بات سے کہ عبدالمطلب نے جو دعا مانگی تھی، وہ مسلمانوں کے طرز پر تھی کچھ تعجب نہیں کیونکہ ہم کو اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بزرگوں میں سے خدا پرستی بالکل ختم نہیں ہو گئی تھی، اس بات کا ایک بڑا قوی ثبوت یہ ہے کہ عبدالمطلب نے اپنے بیٹے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا نام عبداللہ رکھا تھا جو خاص خدا پرستوں کا طریقہ ہے" (خطبات ص ۷۱۸)

حضرت حلیمہ کی تربیت اور قرآن کی زبان

شرفائے مکہ کا دستور تھا، کہ آب و ہوا کے لحاظ سے اور اس غرض سے کہ بچوں کے لہجہ اور زبان میں غیر زبان کا اثر نہ ہونے پائے، اپنے بچوں کو جب وہ آٹھ دن کے ہو جاتے تھے، دودھ پلانے والیوں کے سپرد کرکے باہر بھیج دیا کرتے تھے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حلیمہ سعدیہ کے سپرد کر دیا گیا، وہ اپنے گھر لے گئیں، اور ہر چھٹے مہینے لا کر آپ کی والدہ اور دیگر اقربا کو دکھلا جاتی تھیں، دو برس بعد آپ کا دودھ چھڑا دیا گیا، اور حضرت حلیمہ آپ کو لیکر حضرت آمنہ کے پاس آئیں مگر حضرت آمنہ نے اس خیال سے کہ مکہ کی گرم آب و ہوا آپ کو موافق نہ ہوگی، پھر حضرت حلیمہ کے سپرد کر دیا، اور وہ اُن کو اپنے ساتھ لے گئیں، اور ہر چھٹے مہینے لا کر آپ کو ملا جاتی تھیں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چار برس کی ہوئی تو حضرت آمنہ نے آپ کو اپنے پاس رکھ لیا، اس لئے حضرت حلیمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دودھ پلائی ماں اور اُن کے خاوند حارث، دودھ کے رشتہ کے باپ اور ان کی اولاد عبداللہ، انیسہ اور خزیمہ عرف شیما دودھ شریک بھائی بہن ہوئے عربوں میں قریش، اور خصوصاً یہ شاخ جو بنی سعد کہلاتی تھی عرب میں زبان کی شستگی اور فصاحت کے لئے مشہور تھی، اور اسی سبب سے جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہایت زبردست اور موثر ترین فصیح و بلیغ تھے، عرب فصاحت و بلاغت کی نہایت قدر کرتے تھے، اور جو

شخص فصیح و بلیغ نہ ہوتا، اس کو نظر حقارت سے دیکھتے، اور ذلیل سمجھتے خواہ وہ کیسے ہی نامور اور شریف خاندان کا کیوں نہ ہو،

مگر بنی سعد میں چار برس تک کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش کو، سر ولیم میور قرآن مجید کی فصاحت کا سرچشمہ تصور کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ "اس سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو جزیرہ نمائے عرب کی خوشنما زبان کے خالص ترین نمونہ کے مطابق بن گئی تھی،... جب اُن کی فصاحت و بلاغت ان کی کامیابی میں بڑا کام دینے لگی، تو ایک خالص زبان اور ایک دلفریب گفتگو سے فائدہ عظیم مرتب ہوا" (یعنی آپ قرآن مجید جیسی فصیح و بلیغ چیز پیش کرنے میں کامیاب ہو گئے) مگر کیا قرآن مجید جیسا کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنی سعد میں پرورش کا نتیجہ ہے، ؟ اور کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام، اسی انداز کا ہوتا تھا، جیسا کہ ہم قرآن مجید کی سورتوں میں دیکھتے ہیں، ؟ سرسید نے قرآن مجید اور احادیث نبوی کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

"ایک بات سر ولیم میور صاحب کی نگاہ سے رہ گئی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی متواتر یا مشہور حدیث کو پڑھتے ہیں جس میں یقین کیا جاتا ہے، کہ خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ محفوظ ہیں؛ جیسے دعائیں وغیرہ، تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا طرزِ کلام (اپنی بلندی اور اعلیٰ درجہ کی فصاحت کے باوصف) فصحائے عرب کے طرزِ کلام جیسا ہے لیکن جب ہم قرآن مجید کے مقدس صفحوں کو پڑھتے ہیں تو ہم کو حیرت ہوتی ہے، اور ہمارا تعجب بے انتہا بڑھ جاتا ہے کہ وہ دونوں کلام ایک ہی شخص کے نہیں معلوم ہوتے، اور ہم دونوں میں بہت بڑا فرق پاتے ہیں، اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ اول کلام انسانی ہے، اور دوسرا کلام ربانی"

(خطبات ص ۷۲۱)

عہد طفولیت کے واقعات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک چھ برس کی ہوئی حضرت آمنہ آپ کو اپنے عزیزوں سے ملانے کے لئے مدینہ منورہ لے گئیں، کچھ عرصہ تک وہاں ٹھہریں، اور پھر مکہ معظمہ کو واپس ہوئیں، مگر راستہ میں ابواء کے مقام پر وفات پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہ یتیم پوتے کے دادا عبدالمطلب نے آپ کی پرورش اور نگرانی اپنے ذمہ لی، اور ہمیشہ آپ کے ساتھ شفقت پدری سے پیش آتے رہے، اس دوران میں اور دادا کے انتقال کے بعد بھی، بارہ برس کی عمر تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند واقعات کو، سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں قابل اعتراض ٹھہرایا ہے، مثلاً مدینہ کی چھوٹی چھوٹی بچیوں کے ساتھ ان کا کھیل کود میں مصروف رہنا، اپنے مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو اڑا دینا، دودھ شریک بہن کی پیٹھ میں کاٹ کھانا، اور مدینہ سے حدیبیہ کو جاتے وقت اپنی ماں کی قبر پر رونا، سر ولیم میور نے جس مقصد سے یہ واقعات بیان کئے ہیں ان پر سرسید نے درج ذیل تبصرہ کیا ہے:۔

"اگرچہ ان باتوں کی اور اس قسم کی اور باتوں کی جو سر ولیم میور نے بیان کی ہیں کوئی معتبر سند نہیں ہے، لیکن اگر یہ سب باتیں تسلیم بھی کر لی جائیں، تب بھی یہ ایسی باتیں ہیں کہ جو بچپن میں انسانی فطرت کے مطابق ہوا کرتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ خدا تھے اور نہ خدا کے بیٹے، انھوں نے اپنے آپ کو صرف یہ کہا کہ "انا بشر مثلکم یوحی الی" پس ایسی باتیں اگر ہوئی بھی ہوں تو انسانی فطرت سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتیں،" (ایضاً ص ۷۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے آٹھویں برس آپ کے دادا عبدالمطلب نے بیاسی برس کی عمر میں وفات پائی، سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ "جب آنحضرت جنازہ کے ہمراہ قبرستان حجر کو گئے تو لوگوں نے آپ کو روتے ہوئے دیکھا" لیکن بقول سرسید:۔

"یہ ایک ایسی بات ہے جس سے سر ولیم میور کی خواہش کے برخلاف ہمیں کچھ تعجب نہیں، بلکہ

اگر نہ روتے تو ہمیں نہایت تعجب ہوتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت کم عمر تھے، اور ایسے موقعوں پر آنسوؤں کا نکلنا، اور رنج کے وقت دل میں نرمی اور گداز کا ہونا اور محبت آمیز جوش کا اٹھنا اور آنکھوں کی راہ سے آنسوؤں کا بہنا خدائے رحیم کی طرف سے انسان کے دل کی تسلی اور اس کے رنج کی تسکین کا ذریعہ ہے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی فطرت کی پیروی کی تھی، جو خدا نے انسان میں پیدا کی ہے۔" (خطبات ص ۷۲)

سر ولیم میور اور مولود ناموں کی روایات

بعض مولود ناموں میں جن کے لکھنے والے بھی زیادہ تر کم پڑھے لکھے لوگ ہوا کرتے ہیں، فکر و تخیل سے کام لے کر محض خوش گمانی سے شاعرانہ انداز میں جو کہانیاں لکھ دی گئی ہیں، سر ولیم میور نے ان کا بھی سہارا لے کر اسلام پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی ہے، چنانچہ سرسید احمد خاں فرماتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ولادت میں حضرت آمنہ کا ایک خوفناک اور نامعلوم آواز کو سن کر ڈر جانا، یا ایک سفید مرغ کا اچانک نمودار ہونا اور حضرت آمنہ کے سینہ پر اپنے بازو کا پھیرنا اور اس سے حضرت آمنہ کو اپنے اضطراب میں تسکین پانا یا حضرت آمنہ کے لئے ایک خوشگوار شربت کے پیالہ کا ایک نامعلوم ہاتھ سے ظاہر ہونا یا فرشتوں کی آواز آنا یا بغیر اس کے کسی شخص کا دکھائی دینا، یا اس کے چلنے پھرنے کی آہٹ کا محسوس ہونا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آدمیوں کی نظر سے چھپا لینے کے لئے آسمان سے ایک نور کی چادر کا اترنا، بہشت کے پرندوں کا چہچہانا، بہشت کی خوشبوؤں کا مہکنا، یہ سب شاعرانہ مضمون ہیں، جو غالباً سر ولیم میور نے کسی مولود نامہ سے اخذ کئے ہیں، اور ہر مسلمان جس کو ذرا سا بھی علم ہوگا، سمجھتا ہے کہ یہ تمام باتیں شاعروں کے خیالات ہیں جو انھوں نے اپنے مضامین کو آراستہ کرنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ کی رونق بڑھانے کے لئے بیان کی ہیں، جیسا کہ اس قسم کے واقعات بیان کرنے میں شاعروں کا خصوصاً مشرقی شاعروں میں دستور ہے، حضرت عیسیٰ کی نسبت بھی گرم جوش خیال کے عیسائی شاعروں نے اس قسم کے خیالات نظم میں بیان کئے ہیں، چنانچہ ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ انھی خیالات سے

بھری ہوئی ہے، اس لئے نہایت افسوس کی بات ہے، کہ ایک عیسائی عالم اپنے یہاں کے اسی قسم کے خیالات کو تو شاعرانہ خیالات سمجھے، اور مسلمانوں کی اس قسم کی باتوں کو مذہبی روایتوں کی حیثیت دے کر یہ فیصلہ کرے کہ وہ سب راویوں کی ایجاد ہیں،

شاعروں نے اپنی محبت کے جوش میں اور عقیدت کے طور پر اپنے شاعرانہ انداز میں اور بھی واقعات بیان کئے ہیں، مثلاً "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا ہوتے ہی زمین پر سجدہ کیا، اور اپنی امت کی بخشش کی دعا مانگی، کلمہ پڑھا، تین نورانی فرشتے آسمان سے اُترے، ایک کے ہاتھ میں چاندی کی چھاگل تھی، دوسرے کے ہاتھ میں ایک زمرد کا لگن، اور تیسرے کے پاس رومال تھا، انھوں نے آنحضرت صلعم کو سات مرتبہ غسل دیا، اور آپ کو خیر البشر کا خطاب دیا۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کے یہ واقعات شاعرانہ اظہار خیال کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن سر ولیم میور نے ان کو بھی مذہبی روایات کے طور پر بیان کیا ہے، جو کہ نہایت ہی غلط بات ہے،" (ایضاً ص ۲۲۶-۲۷)

ایک بیجا تنقید سر ولیم میور نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مختون پیدا ہونے کو بھی راویوں کی ایجاد قرار دیا ہے جس کو وہ عجیب و غریب بعید از قیاس اور قانون فطرت کے خلاف قرار دیتے ہیں" اس اعتراض پر سر سید احمد خاں نے اپنے تعجب کا اظہار کیا ہے، وہ یہ فرماتے ہیں کہ

"یہ بات نہ معجزہ سے تعلق رکھتی ہے نہ عجائبات سے، بلکہ اس کا تعلق فطرت کی نیرنگیوں سے ہے جس کی اور بھی نظیریں بتلائی جا سکتی ہیں، مثلاً ایسے اشخاص کا پیدا ہونا جن میں تذکیر و تانیث دونوں کی علامتیں ہوں، ایسے واقعات یہ بتاتے ہیں کہ قوانین فطرت کے مطابق قدرت کی طرف سے کہیں کہیں دوسرے طریق اپنانے میں کوئی عجیب بات نہیں ہے، اس زمانہ میں بھی بعض اوقات مختون لڑکے پیدا ہوتے ہیں اس لئے معجزہ

یا عجائبات کا نام لئے بغیر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مختون پیدا ہونا قابل فہم اور قرین قیاس ہے، اس کا ثبوت اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ کی اولاد میں ختنہ کی رسم بڑی پابندی سے جاری تھی، اور ضروری قرار پا گئی تھی، اور عرب دور جاہلیت میں بھی اس کے ترک کرنے کو گناہ عظیم سمجھتے تھے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ختنہ کی رسم کا ہونا کسی ضعیف ترین روایت میں بھی بیان نہیں کیا گیا، (جس کے صریح معنی یہ ہیں کہ پیدائشی طور پر آپ کے مختون ہونے کی روایت درست ہے، اس کو راویوں کی ایجاد کہکر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، (خطبات ص ۲۲۴)

مہر نبوت مہر نبوت کے بارے میں سر ولیم میور کہتے ہیں کہ

"صفیہ سے نقل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر نبوت ان کی پشت پر نور کے حرفوں میں لکھی ہوئی تھی،"

لیکن سرسید کے خیال میں "تمام مستند محدثین بالاتفاق بیان کرتی ہیں کہ وہ ایک بیا غدود سا تھا، اور اس پر بال تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر چیز کی حرمت اور تعظیم کی جاتی تھی، اس لئے اس کو مہر نبوت کے نام سے موسوم کیا گیا، ہو گا بعض لوگوں کے اس خیال کو کہ اس پر حرف لکھے ہوئے تھے، تمام علمائے اسلام نے نہایت صراحت کے ساتھ رد کیا ہے، پس کیا ایک عیسائی عالم کے لئے یہ بات نازیبا نہیں کہ وہ مسلمانوں پر ایسے امر کے اعتقاد رکھنے کا اتہام لگائے جس سے وہ خود انکار کرتے ہوں، شمائل ترمذی کے حاشیہ باجوری میں لکھا ہے، کہ "یہ جو روایت ہے کہ اس پر پچھنے کے جیسے نشان تھے، یا عنز جانور کے گھٹنے کی مانند، یا غدود سبز یا سیاہ رنگ کا تھا، اور اس پر محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا، یا یہ لکھا ہوا تھا "اے منصور" (انک منصور) ان میں سے کچھ بھی ثابت نہیں ہے، جیسا کہ عسقلانی نے کہا ہے، اور بعض حفاظ حدیث نے کہا ہے کہ جس شخص نے یہ بیان کیا ہے کہ مہر نبوت پر محمد رسول اللہ کے الفاظ لکھے ہوئے تھے، اس کو ہاتھ کی مہر اور اس پشت کے غدود میں جس کو خاتم نبوت کہتے تھے، دھوکا ہو گیا ہے"

کیونکہ وہ عبارت آپ کی مہر میں کندہ تھی نہ کہ پشت کے غدود پر" اس لئے باجوری اور عسقلانی کی تحقیق کے مطابق یہ بات صاف طور پر ثابت ہے کہ جو روایتیں سر ولیم میور نے بیان کی ہیں علمائے اسلام نے ان کو رد کیا ہے، شرح السنہ میں ابی رمثہ سے منقول ہے کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے ان کے باپ نے اس چیز کو دیکھا جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیٹھ پر تھی، اور کہا کہ آپ مجھ کو اجازت دیجئے کہ میں اس کا علاج کر دوں، کیونکہ میں طبیب ہوں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم رفیق ہو، اور اللہ طبیب ہے۔" اس روایت سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز کو مہر نبوت کہتے تھے، وہ کیا چیز تھی، اور صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود اس زمانہ کے مسلمان جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب تھے، اس کو کیا سمجھتے تھے، پس سر ولیم میور نے جو اس کو عجائبات اسلام کے طور پر بیان کیا ہے محض ایک بیجا امر ہے، (ایضاً ص ۳۰۷)

چند اور واقعات

سر ولیم میور نے اور روایتیں بھی درج کی ہیں، جن میں بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوتے ہی اپنے ہاتھوں کو ٹیک کر اٹھ بیٹھے، اور ایک خاک کی مٹھی بھر کر آسمان کی طرف پھینکی لیکن جیسا کہ سر سید احمد خاں نے وضاحت کی ہے کہ

"اس طرح کی باتوں کو خود علمائے اسلام نے غیر صحیح اور نامعتبر قرار دیا ہے، سر ولیم میور ان کو مذہبی روایتیں کہکر بیان کرتے ہیں، تو در اصل وہ یہ چاہتے ہیں کہ اس طرح اسلام کی بے وقعتی ظاہر کریں"

لیکن ان کو یہ نہ بھولنا چاہئے، کہ عام بے پڑھے لوگوں میں جو باتیں مشہور ہو جاتی ہیں، وہ مذہب نہیں بن جاتیں، بلکہ بے سند ہونے کی وجہ سے وہ نامعتبر ٹھہرائی جایا کرتی ہیں،

وہ یہ روایت بھی نقل کرتے ہیں کہ حضرت آمنہ سے ایک نور پیدا ہوا جس نے شام کی تمام گلیوں اور مکانوں کو روشن کر دیا لیکن شرح السنہ میں بیان کی ہوئی یہ روایت اس طرح نہیں ہے جس طرح

کہ سر ولیم میور نے بیان کیا ہے، شرح السنہ میں عرباض بن ساریہ سے منقول ہے، کہ

"رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو اپنے پہلے حال سے مطلع کروں، میں دعا ہوں ابراہیمؑ کی، بشارت ہوں عیسیٰؑ کی اور اپنی ماں کا خواب ہوں (یہ رویا تھی) انھوں نے میرے پیدا ہونے کے زمانہ میں دیکھا کہ ان سے ایک نور پیدا ہوا ہے جس سے شام کے محل روشن ہو گئے،"

پس جن روایتوں میں حضرت آمنہ سے نور پیدا ہونے کا ذکر ہے ان سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آمنہ نے ایسا ایک خواب دیکھا تھا اور اس قسم کا خواب دیکھنا نہ تو تعجب انگیز ہے نہ خلاف قیاس ہے اور نہ ہی فطرت انسانی سے بعید،

(خطبات ص ۳۲۷)

فرشتہ کے ذریعہ "احمد" نام کی تلقین

سر ولیم میور نے واقدی کا ایک بیان یہ نقل کیا ہے کہ حضرت آمنہ نے عبد المطلب سے فرشتہ کا یہ حکم بیان کیا کہ اس لڑکے کا نام احمد رکھنا" وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "حمد" کے مادے سے جو نام مشتق ہوتے ہیں وہ عرب میں رائج تھے، مگر "احمد" نام عرب میں بہت کم ہوتا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا پانچ آدمی اور بھی گذرے ہیں جن کا نام محمد تھا، واقدی کے حوالہ سے وہ یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ یہ نام عرب کے وہ لوگ رکھا کرتے تھے جنھوں نے یہود، نصاریٰ اور کاہنوں کی زبانی سُنا تھا کہ عنقریب عرب میں ایک نبی اس نام کا ہونے والا ہے، اور اکثر لوگ اپنے لڑکوں کے یہی نام رکھا کرتے تھے اور ہر ایک امید کرتا تھا کہ میرا ہی بیٹا نبی آخر الزماں ہونے کی عزت حاصل کرے گا،" مگر سر سید کا خیال یہ ہے کہ:-

اگر حضرت آمنہ نے عبد المطلب سے یہ کہا ہو کہ ایک فرشتہ نے مجھ سے کہا ہے کہ اس لڑکے کا نام احمد رکھنا تو سر ولیم میور صاحب نے اس بات پر کیوں تعجب کیا ہے؟ اگر

توریت مقدس کی کہ یہ آیت کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ دیکھ تو حمل سے ہے
اور تیرے ایک لڑکا پیدا ہوگا اور اس کا نام اسماعیل رکھنا، (پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۱)
اور یہ آیت "اللہ تعالیٰ نے کہا کہ سارہ تیری بی بی کے بیشک ایک لڑکا پیدا ہوگا، اور اس
کا نام اسحاق رکھنا، (پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۹) اور انجیل کی یہ آیت اور اس کے (مریم کے)
ایک بیٹا پیدا ہوگا، اور تجھ کو (یوسف کو) چاہئے کہ اس کا نام عیسیٰ رکھے، کیونکہ وہ اپنی
امت کو گناہوں سے نجات دے گا، (متی باب ۱ آیت ۲۰) صحیح ہے کہ ور عیسائی اس کو
تسلیم کرتے ہیں تو وہ کس بنا پر اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ حضرت آمنہ کو بھی ایک فرشتہ
نظر آیا تھا اور اس نے اس لڑکے کا جو پیدا ہونے والا تھا احمد نام رکھنے کے لئے کہا،

اس روایت کی صداقت کا ایک نہایت تسکین بخش ثبوت یہ ہے کہ (بائبل کے) عہد
عتیق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت محمد کے نام سے آئی ہے، اور انجیل میں احمد کے نام
سے، اس لئے ان بشارتوں کے پورا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ حضرت آمنہ کو احمد کا نام
بتا دیا جائے، کیونکہ یہ ایک ایسا نام تھا جس کو اہل عرب کبھی نہیں، یا شاذ و نادر رکھتے
تھے، (خطبات ص ۲۳۴)

سر ولیم میور کے خیال میں انجیل یوحنا کے یونانی ترجمہ میں پیرکلی ٹوس تھا جس کے معنی
تسلی دہندہ کے ہیں لیکن کسی جاہل یا متعصب راہب نے اس کو "پیریکلیو ٹوس" کر دیا جس کے معنی "حمد"
(تعریف کیا ہوا) ہیں، مگر بقول سرسید انجیل کا صحیح لفظ پیریکلیو ٹوس ہی ہے، جس کا ثبوت یہ ہے
کہ مسلمانوں میں اس کی عربی شکل فارقلیط پائی جاتی ہے، (اصل یونانی نسخہ کی عدم موجودگی میں)
ظاہر ہے کہ عربوں کی روایت ہی قابل ترجیح ہوگی جو فارقلیط کا لفظ استعمال کرتے تھے جو پیریکلیو ٹوس
کی عربی شکل ہے اور اس لفظ کے بارہ میں تاریخ کی یہ قدیم ترین شہادت بتلاتی ہے کہ یونانی نسخہ میں

پیریکلی ٹوس نہ تھا جس کا ترجمہ تسلی دہندہ کیا جاتا ہے))

سر ولیم میور کا یہ دعویٰ کہ عرب میں محمد نام کے اور لوگ بھی گذرے ہیں، سرسید کے نزدیک
بے فائدہ ہے "اس لئے کہ علمائے اسلام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آنحضرتؐ سے پہلے عرب میں اس نام کا اور کوئی
نہیں ہوا، انھوں نے تو اس بات کے دریافت کرنے میں کامیاب کوشش کی، کہ اس نام کے عرب
میں اور لوگ بھی گذرے ہیں، مگر:-

"یہ بات کسی طرح (بائبل کے) عہد عتیق اور عہد جدید کی بشارتوں پر اثر انداز نہیں ہوگی"
کیونکہ کسی لڑکے کے والدین نے اس کے حق میں کچھ ہی تمنا کیوں نہ کی ہو اور نبی موعود کا نام اس
لڑکے کے نبی ہونے کے لالچ میں کیوں نہ رکھا ہو، مگر نبی وہی ہوا جس کو درحقیقت خدائے تعالیٰ
کو نبی آخر الزماں بنانا منظور تھا، ہماری اس رائے کی تائید اس وقت اور بھی ہوتی ہے،
جب ہم ان بڑے بڑے کاموں پر غور کرتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور میں آئے تھے
اور وہ ایسے کام ہیں، جو تمام جہان کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتے، اور جب ہم اس روحانی
کیف و سرور کو دیکھتے ہیں جو دین حق کا طفیل ہے، اور جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
اپنی حیات میں عام کیا تھا، اور جو آئندہ نسلوں میں اپنے ورثہ کے طور پر اپنے پیدا کیا، اور جب
ہم اس سچائی اور پاکبازی پر نظر ڈالتے ہیں جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رائج کیا اور جو زمانہ گزرنے
کے بعد بھی کامل اور بے عیب ہی ہیں اور ابدالآباد تک اصلی حالت پر اسی طرح رہیں گی، تو ہم کو
اس بات کا کامل یقین ہو جاتا ہے، کہ جس محمد اور احمد کی بشارت عہد عتیق اور عہد جدید
میں دی گئی تھی وہ وہی تھے، جو عبداللہ کے بیٹے اور آمنہ کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے
صلی اللہ علیہ وسلم،

(خطبات ص ۲۳۶)

اسپرنگر کی عجیب و غریب دریافت

مستشرقین نے ہر جگہ "عجیب" کی دریافت کی ہے، چنانچہ حضرت آمنہ کا خواب میں فرشتوں کی صورتوں کو دیکھ کر ڈر جانا، ان کے نزدیک صرع یعنی مرگی جیسے مرض کا ثبوت فراہم کر دیتا ہے، جب کہ فرشتوں کو دیکھ کر خوف محسوس کرنا، سرسید کے نزدیک "کسی طرح تعجب انگیز بات نہیں ہے، بلکہ اس کے برخلاف، اس واقعہ سے تو مزید اس بات کی تائید ہو جاتی ہے، کہ حضرت آمنہ نے درحقیقت اپنے خواب میں آسمانی فرشتوں کو دیکھا تھا، سرسید فرماتے ہیں کہ:-

"اسپرنگر صاحب کی عقل اور ایمانداری پر نہایت تعجب ہے کہ وہ اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہ کو ضعیف دماغ اور صرع کی بیماری تھی جب کہ حضرت سارہ اور حضرت مریم نے جو (بائبل کی تصریح کے مطابق) فرشتوں کو دیکھا تھا، اس کو صرع کی بیماری نہیں قرار دیتے۔"

(خطبات ص ۷۳۶)

حضرت حلیمہ کے گھر میں برکت

حضرت حلیمہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچپن میں اپنے گھر پرورش کے لیے لے گئیں، تو کئی طرح سے برکتیں ظاہر ہوئیں، مثلاً انھوں نے محسوس کیا کہ وہ اب بچہ کو خوب سیر ہو کر دودھ پلا سکتی ہیں، بلکہ اس قدر کہ وہ ان کے اپنے بچہ کے لئے بھی کافی ہو جائے گا، اونٹنی کا دودھ بھی بڑھ گیا، وہ بچہ کو لے کر چلیں تو سواری کی رفتار خود بخود تیز ہو گئی، اور مویشی بھی فربہ ہوتے چلے گئے، اور کثرت سے دودھ دینے لگے، سر ولیم میور نے یہ اور اس طرح کے کئی واقعات غالباً تعجب انگیز سمجھ کر نقل کئے ہیں، لیکن اس موقع پر سرسید نے یہ واضح کر دیا ہے کہ "یہ سب باتیں ایسی ہیں، جن کی سند بجز حلیمہ کے بیان کے اور کوئی نہیں ہے، لیکن ایسے امور کا واقع ہونا کچھ ناممکن بھی نہیں ہے"، وہ لکھتے ہیں کہ

"ایسی باتوں کو عیسائی عالم بطور دور از قیاس باتوں کے بیان کرتے ہیں تو بلا شبہ ہم کو تعجب ہوتا ہے کیونکہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ لابان نے اس سے کہا کہ میں التجا کرتا ہوں کہ اگر تجھ کو میرا خیال ہے تو ٹھہر جا، کیونکہ مجھ کو تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تیری وجہ سے مجھ کو برکت دی ہے" (پیدائش باب ۳۰، آیت ۲۰) اور عیسائی عالم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یعقوب نے کہا کہ میرے آنے سے پیشتر تیرے پاس بہت تھوڑا تھا اور اب وہ کثیر التعداد ہو گیا ہے اور جب سے کہ میں آیا ہوں اللہ تعالیٰ نے تجھ کو برکت دی ہے (پیدائش باب ۳۰، آیت ۳۰) آیت ۳۶ سے ۴۲ تک کے مضمون سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لابان کے مویشی کو یعقوب کے مویشی سے کمزور پیدا کیا تھا تو کیا وجہ ہو کہ اگر خدا نے حلیمہ کے مویشی میں بھی برکت دی تو اس کو دور از قیاس قرار دے کر تعجب انگیز طور پر بیان کیا جائے" (خطبات ص ۷۳۷)

حیات رسول میں کسی مرض کی جستجو

سر ولیم میور اور کئی دوسرے مستشرقین کی دماغی صحت کا یہ حال ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیرت انگیز سیرت طیبہ، اعلیٰ کارناموں اور عظیم صفات کی اصل وجہ اور حقیقی سرچشمہ، اس بیماری کو قرار دیتے ہیں جو صرع یعنی مرگی کے نام سے موسوم ہے اور اس طرح وہ دراصل اپنی سیاہ باطنی، اندھی عصبیت اور اپنی کوتاہ فہمی یا بد دیانتی کی آخری حد پر نظر آتے ہیں۔

سر ولیم میور کہتے ہیں کہ ابن ہشام اور دیگر متاخرین یہ بیان کرتے ہیں کہ حلیمہ کے شوہر کو یہ گمان ہوا کہ لڑکے کو ایک عارضہ (آزار) ہو گیا ہے، سر ولیم میور نے فٹ کا انگریزی لفظ استعمال

کیا ہے، جس کے معنی ہیں لغت میں کسی مرض کے ایسے سخت اور یکبارگی حملہ کے ہیں جس سے بدن کپکپانے لگے، اور کبھی غشی طاری ہو جائے، اس سے موصوف نے غالباً صرع (مرگی) مراد لی ہے، مگر سرسید فرماتے ہیں کہ:-

"ہمارے پاس سیرت ابن ہشام موجود ہے جو ڈاکٹر فرڈیننڈ وسن فیلڈ کی نگرانی میں ۱۸۵۸ء میں گاٹن میں چھپی ہے، اس کتاب سے ہم وہ عبارت نقل کرتے ہیں:-

قالت وقال لی ابوہ یا حلیمۃ لقد خشیت ان یکون ھذا الغلام قد اصیب فالحقیہ باھلہ یعنی حلیمہ نے کہا کہ اس کے باپ (دودھ شریک باپ اور حلیمہ کے شوہر) نے کہا کہ اے حلیمہ! مجھ کو اندیشہ ہے کہ اس لڑکے کو کچھ ہو گیا ہے، اس لئے اس کو اس کے گھر والوں کے پاس پہنچا دے، مگر جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت آمنہ کے پاس لے کر آئیں تو حضرت آمنہ نے اُن کو نہیں لیا، اور حلیمہ سے کہا کہ اس کو واپس لے جاؤ اور فرمایا کہ کیا تجھ کو یہ اندیشہ ہوا تھا کہ اس پر شیطان مسلط ہو گیا ہے، (یعنی تمہارا یہ خیال درست نہیں ہے) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلیمہ کے شوہر کو جو گمان ہو گیا تھا وہ صحیح نہیں تھا،"

سر ولیم میور نے ایک غلطی تو یہ کی ہے کہ اپنی کتاب کے ص ۲۱ (حاشیہ) پر لفظ "اُصیب" کو "اَصیب" لکھا ہے، دوسری غلطی یہ کی ہے کہ اس سے وہ (FiT) یعنی مرگی جیسی بیماری مراد لیتے ہیں، ایک دو کے سوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری لکھنے والے تمام عیسائی مصنفین، یہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صرع (مرگی) کی بیماری لاحق تھی، بہت تلاش کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ یہ خام خیالی عیسائیوں

میں دو وجہ سے پیدا ہوئی، ایک تو ان کے مذہبی توہمات کی وجہ سے اور دوم عربی عبارت کے لاطینی میں غلط ترجمہ ہو جانے کی وجہ سے۔"

ڈاکٹر پوکاک نے تاریخ ابو الفداء کا لیٹن میں ترجمہ کیا، جو سنہ ۱۷۲۲ء میں آکسفورڈ میں شائع ہوا، اس میں فالحقیہ کو "بالحقیقۃ" بنا دیا گیا، اور چونکہ اس کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لئے ترجمہ میں اس کو تو چھوڑ دیا گیا، اور اصیب جس کے معنی صرف بیماری کے ہیں، اس کے لئے لیٹن میں جو الفاظ درج ہوئے، اس میں یہ ترجمہ کر دیا گیا کہ اس لڑکے نے کسی اپنے ساتھی سے دماغی بیماری کو اخذ کر لیا ہے، اس مترجم نے دماغی بیماری سے غالباً صرع یا بیہوش کر دینے والی بیماری مراد لی ہے، حالانکہ یہاں صحیح ترجمہ یہ تھا کہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ یہ لڑکا مبتلا ہو گیا ہے بس اس کو اس کے گھر والوں کے یہاں پہونچا دو۔"

عرب ان تمام بیماریوں کو جن کا سبب معلوم نہ ہوتا خبیث روحوں اور شیطان کا اثر سمجھتے تھے، عیسائی مصنفوں نے اپنے وہمی ذہن سے، یہ سمجھ لیا کہ یہ بیماری صرع تھی، حالانکہ عرب صرع ہی کو نہیں، بلکہ ہر ایک پیچیدہ بیماری کو شیطان کا اثر سمجھتے تھے، لیکن ایک عیسائی مورخ گبن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس بیماری سے متعلق لکھا ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یونانیوں کا ایک نامعقول اتہام ہے"۔

سرسید احمد خاں نے صرع کے بارے میں پہلے تو طبی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے، چیمبرز ان سائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے، کہ صرع اس بیماری کو کہتے ہیں جس میں سلسلہ رک جانے اور اعصاب میں تشنج پیدا ہو جانے کی وجہ سے، بے اختیار ہو کر شدت سے اعصاب پھڑکنے لگیں، اور کبھی سانس بالکل ہی بند ہو جائے، اس بیماری میں مریض اکثر پاگل ہو جاتا ہے، بسا اوقات اس کا حافظہ جاتا رہتا ہے، اس میں تیزی اور چستی نہیں رہتی، مردہ دلی اسے کاروبار سے معذور کر دیتی ہے، بدہضمی بھی اکثر ہوتی ہے، تمام جسم میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے، اس کے چہرہ سے دائمی نقاہت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، ایسے مریض کے

ذہن میں اپنی کمزوری کا یقین جم جاتا ہے، اور اسے مشقت طلب کاموں سے نفرت ہو جاتی ہے
اس تفصیل کے بعد، سرسید نے نہایت وضاحت کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ

"کوئی مورخ مسلمان یا عیسائی یہ نہیں بیان کرتا، کہ مذکورہ بالا اثرات میں سے ایک بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں پایا گیا تھا، بلکہ اس کے برخلاف سب اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرتؐ اپنے بچپن اور جوانی میں نہایت تندرست، اور قوی تھے، خود سر ولیم میور کہتے ہیں کہ دو برس کی عمر میں حلیمہ نے ان کا دودھ چھڑایا، اور ان کے گھر لے گئیں، آمنہ اپنے لڑکے کو تندرست اور قوی ہیکل دیکھ کر جو آپ سے دوگنی عمر والے لڑکے کے برابر معلوم ہوتی تھی، اس قدر خوش ہوئیں کہ حلیمہ سے کہا کہ اس کو پھر لیجا، لڑکپن اور جوانی کے زمانہ میں آنحضرت مضبوط، تندرست اور قوی تھے، بہت تیز چلا کرتے، اور زمین پر مضبوطی سے قدم رکھتے، تمام عمر بھر ان کو بڑے بڑے خطرے، اور تکلیفیں پیش آئیں ان سب کو انھوں نے کمال صبر و استقلال سے برداشت کیا، انھوں نے خدائے واحد کی پرستش و عبادت کی تجدید ایسے طور پر کی، جس کی کوئی مثال نہیں پائی جاتی، علم الٰہیات کو ایسے پختہ اور معقول اصول پر قائم کیا جن کا ہمسر جہان سے معدوم ہے، انھوں نے قوانین تمدن و اخلاق کو ایسے کمال پر پہنچا دیا، جو اس سے پیشتر کبھی نہیں ہوا تھا، ان کے ذریعہ انسانوں کی بہبود اور فلاح کے لئے وہ ملکی و مالی، دینی و دنیوی قوانین کا مجموعہ حاصل ہوا، جو اپنی نوعیت کا یکتا و بے نظیر ہے آنحضرت ہی وہ ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں تمام جزیرۂ عرب کو فتح کیا، اور مختلف قبیلوں کو متحد کر کے ایک عظیم الشان مضبوط اور طاقتور قوم بنا دیا جس نے اس زمانہ کی مہذب دنیا کے بڑے حصہ کو معمولی عرصہ میں مفتوح و مسخر کر لیا، کیا یہ

خیال عقل و انصاف کی رو سے درست ہوگا، کہ ایسے نمایاں کارنامے ایک لاچار اور ناتواں، صرع کی بیماری میں مبتلا شخص سے وجود میں آسکے ہوں گے، ایسے نمایاں کارنامے اسی شخص کے ذریعہ عمل میں آسکتے ہیں، جس کی روحانی وجسمانی قوتیں صحیح و سالم ہوں، اور جس کو تائید ربانی حاصل ہو،

(خطبات ص ۳۴۵-۳۸،)

سر ولیم میور کہتے ہیں، کہ حلیمہ پھر ایک بادل کو آنحضرتؐ کے سر پر سایہ فگن دیکھ کر گھبرائیں اور انجام کار ان کو ان کی ماں کے پاس پہنچانے کے لئے روانہ ہوئیں، تعجب کی بات یہ ہے کہ بادل کو سایہ کرتے ہوئے تو دیکھا حلیمہ نے اور سر ولیم کو اس سے آنحضرتؐ کی بیماری کا خیال آگیا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر اگر کبھی بادل کا ٹکڑا سایہ دار آگیا ہو تو یہ بات ناممکن نہیں، البتہ یہ خیال کہ آپ پر ہمیشہ بادل سایہ کئے رہتے تو اس کی کوئی سند نہیں ورنہ اکثر صحابہ اس کا ذکر کرتے، اور مستند حدیثوں میں بھی اس کا تذکرہ ہوتا،

ایک مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کے وقت جو کیفیت طاری ہوتی تھی، سر ولیم میور اُسے بھی "صرع" کی بیماری کا اثر ثابت کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں جس پر سرسید احمد خاں نے اس طرح اظہار خیال فرمایا ہے:

"ہم سر ولیم میور کی اس رائے کو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صرع کے دوروں نے ان کے ذہن میں اپنی رسالت کا خیال پیدا کر دیا، اور ان کے متبعین کا بھی یہی اعتقاد تھا، تمام منصف مزاج اور غیر متعصب لوگوں کے روبرو پیش کرنا چاہتے ہیں، اور پھر یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ بات قرین قیاس ہے کہ ایسا آدمی جس کو ہر آدمی مصروع جانتا ہو اپنے صرعی غشوں کو اپنے رسول برحق ہونے کے ثبوت میں پیش کرے، اور جو شخص اپنی قوم کی بت پرستی کو مٹانے کے لئے بھیجا گیا ہو اور تمام لوگ اس کی اس بیماری سے واقف ہوں لیکن

اس کے باوجود اس کے عزیز و اقارب اور عرب کے تمام بڑے بڑے لوگ اس کی رسالت
کو دل سے تسلیم کرلیں اور اپنے آبائی مذہب اور قدیم رسموں کو چھوڑ کر، اس شخص کے قول
فعل پر کامل ایمان لے آئیں،

(خطبات ص ۲۴۷)

اہلِ کفر کے لئے دعائے مغفرت

سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ ان لوگوں کی مغفرت کی دعا مانگنے کی ممانعت کر دی جو
حالتِ کفر میں مرے ہوں پیغمبر صاحب کے حکموں کی سختی اور شدت کی ایک عجیب مثال ہے"
مگر سرسید فرماتے ہیں کہ "ہمارے نزدیک ان لوگوں کے حق میں دعائے مغفرت نہ کرنے میں جو خدائے واحد پر
ایمان نہ رکھتے ہوں، اور انبیائے سابقین کے دین کو بھی نہ مانتے ہوں، بلکہ محض بے ایمانی کی حالت میں
مرگئے ہوں، کسی طرح کی سختی اور شدت نہیں ہے، بلکہ یہ بات زندہ آدمیوں کو بت پرستی کے چھوڑنے
اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اقرار کی ترغیب دینے کے لئے ایک نہایت کارآمد اور عمدہ ذریعہ تھا،
مگر ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اگر مذکورہ سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر سختی اور شدت
کا الزام لگایا گیا ہے، تو "رحم دل" عیسائی مذہب میں ان لوگوں کے لئے جو اگرچہ اللہ تعالیٰ کو
مانتے ہوں، مگر حضرت عیسیٰ ع کے ابن اللہ ہونے سے انکار کرتے ہوں، کیسا نرم فیاضانہ اور
اور رحم دلی کا سلوک کیا گیا ہے، مگر افسوس ہے کہ ہماری یہ امیدیں پوری نہیں ہوئیں، بلکہ سرسید
کے اپنے الفاظ میں :-

"ہماری توقع کے خلاف "رحم دل" عیسائی مذہب میں غیر عیسائیوں کے لئے
اس سے بھی زیادہ سخت احکام معلوم ہوئے، اس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ اتھنیسین
خطبہ ہے جو انگلستان کے تمام پروٹسٹنٹ گرجاؤں میں تین دنوں میں پڑھا جاتا ہے،
اور تمام اہلِ کلیسا کے اتفاق سے منظور ہوا ہے۔ ان سب عقیدوں کو بیان کرنے

کے بعد جن کا ماننا ہر شخص پر فرض ہے، صاف طور پر یہ لکھا گیا ہے کہ یہ عیسوی عقیدہ ہے
جس پر عقیدہ رکھے بغیر کوئی آدمی نجات نہیں پا سکتا۔" تو جب کہ "رحم دل" عیسوی
مذہب کے مطابق ایسا شخص نجات کا مستحق نہیں ہے، اور اسی لئے کسی کی دعائے مغفرت
بھی اس کے حق میں مفید نہیں ہے، تو عیسوی مذہب کو اس بارہ میں مذہب اسلام
پر کیا فوقیت ہے؟"

(خطبات ص ۳۴۹)

سامان خورد و نوش میں برکت

سر ولیم میور اپنی کتاب میں ایک روایت یہ بھی نقل کرتے ہیں، کہ جب آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کھانے پر موجود نہ ہوتے، تو تمام خاندان کے لوگ ایسے
کفایت شعار کھانے سے (فارغ ہونے پر بھی) بھوکے ہی اٹھتے تھے لیکن جب پیغمبر صاحب بھی کھانے میں
میں شریک ہوتے، تو سب کا پیٹ بھر جاتا تھا"
پھر سر ولیم میور اس پر تبصرہ کرتے ہیں کہ اس بات کو عروج پذیر نبی کی بڑائی اور عظمت
خیال کیا جاتا لیکن سر ولیم میور نے اس موقع پر بھی اسلام پر اعتراض کرتے ہوئے اپنی مذہبی
روایات کو نظر انداز کر دیا ہے، چنانچہ سرسید احمد فرماتے ہیں کہ

"ہم کو تعجب ہے کہ عیسائی ایسی روایتوں کو اعتراض کی نیت سے نقل
کرتے ہیں (حالانکہ) ان کو ایسے واقعہ کے امکان پر اعتقاد نہ رکھنے کی کوئی وجہ
نہیں ہے، جب کہ وہ متی باب ۱۴ آیت ۱۹-۲۰ کے اس بیان کو مانتے ہیں
کہ "اس نے (حضرت مسیح نے) جماعت کو (جن کی تعداد پانچ ہزار تھی) گھاس پر
بیٹھنے کا حکم دیا، اور پانچوں روٹیاں اور دونوں مچھلیاں نکالیں، اور آسمان
کی جانب نظر اٹھا کر دعا کی، اور ان کو توڑا، اور اپنے حواریوں کو دیں، اور
حواریوں نے جماعت کو تقسیم کیں، اور ان سب نے پیٹ بھر کے کھائیں، اور

بچے ہوئے ٹکڑوں کو جن سے بارہ ٹوکرے بھر گئے اٹھا لیا۔"

آنحضرتؐ کے سفر شام سے نبوت کا تعلق

سر ولیم میور نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر شام سے متعلق ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ

"جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ملک شام کو گئے، تو بحیرہ راہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور لوگوں کے درمیان اس نشان سے پہچان لیا تھا کہ آپ کے سر پر ایک بادل سایہ کئے ہوئے چلتا تھا، اور درختوں کی شاخیں آپ کے اوپر دھوپ روکنے کے لئے جھک جاتی تھیں، اور بحیرہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کئے، اور مہر نبوت کو معلوم کرنے کے لئے آپ کے جسم کا معائنہ کیا۔"

شام کے اس سفر میں، سر ولیم میور کا یہ خیال ہے کہ:-

"زمانہ سابق کے منہدم اور اجڑے ہوئے مقامات نے جن کو خیالی قصوں عجیب وغریب جانات اور دل کش روایتوں نے اور بھی مؤثر بنا دیا تھا اور گرجاؤں صلیبوں مورتوں، آراستہ مذہبی نشانات و آثار اور گھنٹوں کے بجنے کی قومی رسموں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غور و فکر کرنے والے دل و دماغ پر ایک گہرا نقش چھوڑا اور پائیدار اثر ڈالا تھا"

سر سید نے، سر ولیم میور کے جواب میں اول تو ترمذی کی یہ روایت پیش کی ہے کہ ابو طالب نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ابوبکرؓ اور بلالؓ کے ہمراہ شام سے واپس بھیجا تھا" وہ یہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو سال چھوٹے تھے، اور بلالؓ اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، اور یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۱۲ سال کی تھی، اس لئے آپ کو ان دونوں حضرات کے ساتھ شام سے واپس بھیجا

سوال ہی نہیں اٹھتا لیکن، اگر اس واقعہ کو تسلیم کر لیا جائے تب بھی سرسید کے نزدیک یہ بات ہرگز لائق تعجب نہیں کہ بحیرہ راہب کو آپ کے بارہ میں نبی ہونے کا گمان ہوا ہو، کیونکہ اس وقت یہود و نصاریٰ ایک مسیحا اور ایک فارقلیط کے منتظر تھے، مگر یہ بات کہ ۱۲ سال کی عمر میں، آپ نے محض ایک ہی سفر میں، اور معمولی سے وقت میں بحیرہ راہب سے، نبوت کا کامل سبق پڑھ لیا، اور تقریباً ۳۰ برس کے بعد اس کو اچانک لوگوں کے سامنے پیش فرمایا، یہ بات سر ولیم میور کے شر انگیز لیکن زرخیز ذہن کی پیداوار تو ہو سکتی ہے لیکن کیا ایسا ہونا ممکن بھی ہے؟ اور پھر سر ولیم میور یہ بھی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مرگی زدہ شخص تھے، اس موقع پر سرسید احمد خاں فرماتے ہیں کہ

"ہم سر ولیم میور سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایک مصروع شخص کا دل و دماغ ایسا اثر قبول کر سکتا ہے اور کیا ایک مصروع شخص کے دل و دماغ میں غور و فکر کی اس قدر صلاحیت ممکن ہے، اگرچہ سر ولیم میور کا یہ بیان نہایت دلچسپ ہے' مگر افسوس ہے کہ ہم اس بیان سے اتفاق نہیں کر سکتے، کیونکہ اسی لڑکے نے جس کا دماغ صلیبوں، مورتوں، اور دین عیسوی کی علامتوں کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوا تھا' بعد میں انہی چیزوں کی مخالفت کی، صلیب کو توڑا، مورتوں کو پھوڑا، ان کی پرستش سے منع کیا، اور یہ بتایا کہ خدا کا کوئی بیٹا نہیں ہے تثلیث کے عقیدہ کو جھٹلایا، خدا کو وحدہٗ لاشریک بتلایا، اور اسی کی عبادت کا وعظ کیا، اور تمام دنیا میں اسی کو رواج دیا،

لیکن اس بات کو تسلیم کر کے کہ مذکورہ بالا چیزوں نے اس لڑکے کے دل پر درحقیقت اثر ڈالا تھا، ایک اور خیال خود بخود دل میں آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسا لڑکا جس کے ابتدائی چار برس ایک صحرا میں گذرے تھے، اور پھر وہ آٹھ

برس تک مشرک اور بت پرست لوگوں میں گھر ا رہا، صرف بارہ برس کی عمر میں وہ ا
ایک دل رکھتا تھا کہ ہر چیز سے جو اس کی نظر سے گذر رہی تھی، پرانی منہدم عمارتوں
کے آثار سے گرجاؤں، صلیبوں، مورتوں اور دین عیسوی کی علامات تک، وہ اس
قدر عقل و فہم و ذکا سے آراستہ تھا کہ ان چیزوں کو دیکھ کر انہی کے برخلاف ایسے کامل
نتائج اور معبود غیر ظاہر اور بقائے روح انسانی کے بارے میں ایسے ایسے عالی خیالات
پیش کر سکا، وہ لڑکا بلاشبہہ مادر زاد پیغمبر برحق تھا جس کی فطرت خود اس کی معلم تھی،
اور وہی تھا جس کی نسبت خود حضرت عیسیٰؑ نے یہ کہکر بشارت دی تھی، کہ "سچ تو
یہ ہے کہ میرا چلا جانا تمھارے لئے ضرور ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط (یعنی
احمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم) تمھارے پاس نہیں آوے گا، اور اگر میں چلا جاؤں گا تو اس
کو تمھارے پاس بھیج دوں گا"

(خطبات احمدیہ ص ۵۲)، (ختم)

سلسلہ مقالات سلیمان

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے متعدد بلند پایہ تصانیف کے علاوہ بہت سے علمی، مذہبی، فقہی، تاریخی، ادبی و تنقیدی
مضامین بھی لکھے تھے، ان تمام مضامین کو فن وار کتابی صورت میں تین ضخیم جلدوں میں مرتب کرکے شائع کیا جا چکا ہے،
پہلی جلد تمام تر ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں کے مضامین پر، دوسری جلد خالص علمی و تحقیقی مضامین پر،
تیسری جلد قرآنی و مذہبی مضامین پر مشتمل ہے، تیسری جلد میں علامہ کے وہ معرکۃ الآرا مضامین بھی ہیں، جو انھوں نے
یورپ اور امریکہ کے بعض سرکردہ مستشرقین کے جواب میں لکھے تھے، اور بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے تھے، قیمت:
علی الترتیب ۲۶ روپے، ۲۳ روپے، ۲۳ روپے، بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں، "منیجر"

حضرۃ الاستاذؒ کی اہم تصنیف

تاریخ ارض القرآن پر ایک نظر

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۲)

سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ قریش کے خاندان میں ایک نامور سردار قصی پیدا ہوا تو اس نے قریش کی ایک مستقل
ہستی پیدا کر دی، سید صاحبؒ کے خیال میں قصی کا زمانہ پانچویں صدی کے عہد اواسط کا تھا (ص ۱۰۴)، اس نے قریش کے منتشر
اجزا کو یکجا کیا، اور ایک چھوٹی سی جمہوری ریاست کی بنیاد ڈالی، اس شہری حکومت میں چودہ عہدے تھے، جو دس
عہدیداروں پر منقسم تھے، دس عہدہ دار قریش کے دس قبائل سے منتخب ہوتے تھے، ان عہدوں اور ان کی توضیح خدمات
اور قبیلوں کو سید صاحبؒ نے بڑی محنت سے جمع کر دیا ہے، ان کا جاننا ہمارے ناظرین کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا،
حاجیوں کے کھانے پینے کا سامان (سقایہ) اور خانۂ کعبہ کا انتظام (عمارہ) بنو ہاشم، حاجیوں کی مالی اعانت کا انتظام
(رفادہ) بنو نوفل، خانۂ کعبہ کی دربانی اور کلید برداری (سدانہ) بنو عبد الدار، بتوں سے استخارہ کی خدمت (ایسار)
بنو جمح اور بتوں کے نذرانوں اور جائدادوں کا انتظام (اموال محجرۃ) بنو سہم کے ذمہ تھا، پھر عدالتی نظام میں
عدالت خانہ اور مشورہ گاہ کا انتظام (ندوہ) بنو عبد الدار، امور مہمہ میں مشورہ لینا (مشورہ) بنو اسد، خونبہا،
جرمانہ اور مالی تاوان کا انتظام (اشناق) بنو تیم، مقدمات کا فیصلہ (حکومتہ) بنو سہم کے سپرد تھا، پھر جنگی معاملات
میں نشان قومی کی علم برداری (عقاب) بنو امیہ، فوجی کیمپ کا نظم (قبہ) بنو مخزوم، سواروں کے رسالہ کی سپہ سالاری

(اعنہ) بنی مخزوم اور سفارت (سفارت) بنو عدی کے حوالے تھیں۔ (ص ۱۰۶ - ۱۰۵) اس چھوٹی سی شہری جمہوریت کا ایوان حکومت دار الندوۃ کے نام سے موسوم تھا، اس کا بانی بھی قصی تھا، ہر قسم کے فیصلے اسی عمارت میں صادر ہوا کرتے تھے، قریش نے داعیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا مجرمانہ فیصلہ بھی اسی دار الندوۃ میں کیا تھا، (ص ۱۰۶) وہ زیادہ تر تجارتی کاروبار کرتے تھے، عرب سے نکل کر ان کے تاجر عراق، ایران، شام، بلکہ ایشیائے کوچک تک ان کے تاجر گذرتے تھے، (ص ۱۰۶) پھر قریش اور قرآن مجید کا عنوان قائم کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ قریش کے افراد اور اشخاص کے الہامی تذکرے تو قرآن مجید میں کثرت سے ہیں، لیکن نام کے ساتھ قریش اور موالی قریش میں تین اشخاص کا ذکر ہے، ایک تو خود رسالت مآب محمد صلی اللہ علیہ وسلم، دوسرے زید بن حارثہؓ اور تیسرے ابولہب، پھر اس کی تفصیل بتائی گئی ہے کہ یہ نام کیسے اور کس طرح آئے جو عام طور سے ہمارے ناظرین کو معلوم ہے۔

قریش کے بعد ارض القرآن کی قوموں اور قبیلوں کی تاریخ ختم کر دی گئی ہے، ان کھوئی اور بھلائی ہوئی قوموں کی تاریخ لکھنا آسان نہیں تھا، لیکن جس طرح اس مشکل سے سید صاحب عہدہ برآ ہوئے ہیں، اس سے علم الاقوام سے ان کی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے، اور پھر جس طرح ان کے بکھرے اور منتشر واقعات کو قلمبند کیا ہے اس سے ان کی تحقیق و تلاش میں محنت شاقہ اور علم و فن کے قلمرو میں ان کے قلم کی طاقت اور استیلاء کا بھی اندازہ ہوتا ہے، اب تک ان قوموں کی وہ سیاسی تاریخ لکھ رہے تھے، بقیہ ابواب میں ان کی تجارتی، لسانی اور مذہبی سرگرمیوں کے کوائف ہیں۔

عربوں کی تجارت

عربوں کے تجارتی حالات زیادہ تر توراۃ، قرآن مجید اور یونانی تاریخوں کے حوالہ سے لکھے گئے ہیں، اور اس خشک موضوع کو بھی سید صاحبؒ نے اپنی تحریر کے ذریعہ سے پُر مغز اور پُر از معلومات بنا دیا ہے، عربوں کی تجارتی سرگرمیوں سے متعلق بعض اہم بیانات سے پوری تصویر سامنے آجاتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ملک عرب کا زیادہ تر حصہ غیر آباد اور سنگستان ہے، اس لیے طبعاً وہاں زراعت سے زیادہ تجارت کے کاروبار کو فروغ ہونا چاہیے، اس کے آباد حصے تمام ملک کے تین طرف بحری سواحل پر واقع ہیں، مغرب سے چلیے بحرین اور عمان خلیج فارس پر، شمال میں حضر موت اور یمن بحر عرب پر اور مشرق میں حجاز و مدین بحر احمر پر واقع ہیں، اندرون ملک کا جو حصہ زرخیز ہے،

مثلاً یمامہ، نجد اور یثرب وغیرہ ان میں کاشتکاری ہوتی تھی، عرب کے یہ ساحلی صوبے دنیا کے بڑے بڑے ممالک کے آمنے سامنے واقع ہیں، عمان و بحرین، ایران و عراق سے متعلق ہیں، یمن اور حضر موت کو افریقہ اور ہندوستان سے تعلق ہے، حجاز کے سامنے مصر ہے، اور شام کا ملک اس کے بازو پر واقع ہے، اتنا لکھنے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ عربوں کی تجارت ان ہی ہمسایہ ملکوں سے تھی، پھر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بحرین کے پاس کچھ عرب تاجروں نے انتقال مکان کر کے بحر روم، بحر ابیض، بحر متوسط کے سواحل پر جو شام و کنعان کے بحری مقامات تھے سکونت اختیار کر لی تھی، بنی اسرائیل ان کو آرامی، کنعانی اور اہل یونان انکو فینیقین (فنیشین) کہتے تھے، ان فنیقی عربوں نے یورپ اور افریقہ کے انتہائی ملکوں تک اپنے تجارتی سلسلے پھیلا رکھے تھے، (ص ۱۱۱ - ۱۱۰) مگر اس کے بعد سید صاحبؒ نے جو کچھ لکھا ہے وہ حیرت سے پڑھا جائے گا کہ یونان میں تہذیب و تمدن کا آغاز ان ہی بیوپاریوں کے ذریعہ سے ہوا، اور رفتہ رفتہ یہ چنگاریاں دور دراز تک اپنی روشنی کی شعاعیں ڈالتی چلی گئیں، (ص ۱۱۱) اندرون ملک ان کے تجارتی شہر بحرین یا یمامہ، حضر موت، شبوۃ، قانہ، مآرب، عدن، اوزال، مدین اور ایلہ وغیرہ تھے، (ص ۱۱۴) اسی اجمال کی پوری تفصیل اس باب میں ملے گی، عربوں کے تجارتی راستوں اور شاہراہوں کا بھی ذکر آیا ہے، اس کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ جو تجارتی شاہراہ حجاز ہو کر یمن تک کو جاتی تھی، قرآن مجید نے اس کو امام مبین (ظاہر راستہ) کہا ہے، سبا کے تجارتی قافلوں اور ان بے خوف و خطر منزلوں کا ذکر بھی قرآن مجید میں ہے، اور پھر حضرت یوسفؑ کے قصہ میں تجارتی قافلہ کی گذر گاہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اور اس کی تصدیق توراۃ اور یونانی مورخوں کی تحریر سے بھی کی گئی ہے (ص ۱۱۳) اس کی نشان دہی بھی کی گئی ہے کہ مسلمان جغرافیہ نویسوں میں ابن الحائک ہمدانی نے اپنی کتاب "صفۃ جزیرۃ العرب" میں ان تجارتی راستوں کی تفصیل لکھی ہے، حضر موت سے لے کر عقبہ تک تقریباً ۱۱۰ دن کا راستہ تھا، (ص ۱۱۵)

پھر اس کی تفصیل بھی ہے کہ یہ عرب کن کن چیزوں کی تجارت کرتے تھے، ان میں عموماً تین چیزیں ہوتی تھیں، (۱) کھانے کا مسالا اور خوشبودار چیزیں (۲) سونا، جواہرات اور لوہا (۳) چمڑا، کھال، زین پوش، بھیڑ اور بکری (ص ۱۱۶) اس کی معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں کہ عود، لوبان اور بخورات سبا اور حضر موت کے علاقہ میں پیدا ہوتے تھے،

(ص ۱۱۸) موتی خاص سواحل عرب کی چیز ہے، بحرین و عمان کے دریاؤں میں موتی کے خزانے ہیں، اس کا ذکر قرآن مجید کے سورۂ رحمٰن میں بھی ہے، (ص ۱۱۹) عرب میں سونے کی بڑی کانیں تھیں، ان کے سونے کی شہرت یروشلم اور اسکندریہ کے بازاروں میں تھی (ص ۱۱۹) عرب کی کھالیں بھی سامان تجارت میں نظر آتی تھیں، یمن کی کھال تو بہت مشہور تھی یہاں تک کہ فارسی شعراء کے کلام میں اس کی تلمیحات ملتی ہیں، (ص ۱۱۹)

اس قسم کی تفصیلات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عرب اپنا سامان فروخت کرکے غیر ملکوں سے مسالہ یعنی لونگ، سیاہ مرچ، الائچی، لونگ، دارچینی، ناریل، املی (ص ۱۱۸) کپڑا، غلہ، شراب، ہتھیار، آئینہ اور آرائش کی چیزیں لاتے تھے،

(ص ۱۲۰) عربوں کے تجارتی بازار کی بھی تفصیل ہے، یعقوبی اور امام مرزوقی کی کتاب الامکنۃ والازمنۃ کے حوالے ان کے بڑے بڑے میلوں کا ذکر ہے، جو اس زمانہ میں لگا کرتے تھے، یہ میلے دومۃ الجندل، مشقر، صحار، دبا، شحرۃ، عدن، صنعا، حضرموت، عکاظ، ذوالمجاز، منیٰ، خیبر اور یمامہ میں لگتے تھے، (ص ۱۲۲) قرآن مجید میں قریش کا ذکر آیا ہے اور ان سے داعیٔ اسلام صلعم کی ٹکر ہوئی، اس لیے اس باب میں ان کی تجارت کا بھی ذکر آیا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قریش تاجر قبیلہ تھا، وہ زراعت اور کاشتکاری کو ذلیل ترین پیشہ سمجھتے تھے، (ص ۱۲۴) اس لیے وہ زیادہ تر تجارت کرتے تھے، جاڑوں میں یمن اور گرمیوں میں شام بلکہ ایشیائے کوچک تک قریشی سوداگر جاتے تھے، (ص ۱۲۴) وہ چمڑا اور چاندی کی تجارت زیادہ کرتے تھے، (ص ۱۲۷) قریش کی تاجرانہ ترقی کی انتہا یہ تھی کہ بیوہ اور لاچار عورتیں تک اپنا سرمایہ تجارت میں لگاتی تھیں، دوسروں کو اپنا روپیہ دیتی تھیں کہ وہ اس سے تجارت کریں اور نفع میں شریک ہوں، حضرت خدیجہ رضی اپنی بیوگی کے زمانہ میں اسی طریقہ سے تجارت کرتی تھیں، ان کا سامان تجارت ہر سال شام کو جایا کرتا تھا، (ص ۱۲۶) قریش عکاظ اور ذوالمجاز کے میلوں میں اپنے تجارتی سامان کے ساتھ شریک ہوتے، اسلام کے بعد قریش کی تجارتی سرگرمی افسردہ نہ ہوئی، حضرت ابوبکر رضی کپڑے کی تجارت کرتے تھے، حضرت عمر رضی کی تجارت کا سلسلہ ایران تک پھیلا ہوا تھا، حضرت عثمان رضی بنو قینقاع کے بازار میں کھجوروں کی تجارت کرتے تھے، عبدالرحمٰن رضی بن عوف پنیر بیچتے تھے، حضرت زبیر رضی بھی کپڑے کے تاجر تھے، عام مہاجرین مدینہ کے اندر زیادہ تر تجارت ہی

کرتے تھے، (ص ۱۲۸ - ۱۲۷)

عربوں کی مختلف زبانیں

سید صاحب نے ارض القرآن کی مختلف زبانوں پر بھی بڑی دقیق بحث کی ہے، اپنی اس کتاب میں اللغۃ العرب قبل الاسلام کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک علم اللسنہ میں بھی ان کی نظر کتنی گہری ہو چکی تھی، اس میں جو فنی مباحث ہیں ان کو تو ماہر لسانیات ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، لیکن عام ناظرین کے فہم و ادراک کے لیے جو چیزیں لائق توجہ ہو سکتی ہیں ان کو سید صاحبؒ ہی کے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

عرب کی قومیں سامی تھیں، سامی زبانیں تین مرکزوں میں تقسیم ہو گئی تھیں، عربی، بابلی، اور شامی،

عربی کی مختلف شاخیں یہ تھیں، آرامی، ثمودی، مدیانی، نبطی، عدنانی، سبائی، حمیری اور حبشی وغیرہ۔

بابلی کی شاخیں یہ تھیں: آرامی، کلدیانی، سریانی۔

شامی کی شاخیں یہ تھیں: آرامی، فنیقی، عبرانی، تدمری۔

ان میں سید صاحبؒ نے اپنے موضوع کے لحاظ سے عربی کی مختلف شاخوں ہی پر پوری بحث کی ہے، وہ عربی زبان کی پہلی شاخ کو آرامی کہتے ہیں، ان کا بیان ہے کہ شام کی قدیم ترین زبان کو ملکی حیثیت سے عربی اور قومی حیثیت سے آرامی کہنا چاہیے (ص ۱۳۰) بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آرامی زبان ہر جگہ پہونچی اس لیے بابلی اور شامی شاخوں میں بھی آرامی دکھائی دیتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ عبرانی زبان سب سے قدیم ہے، یہی حضرت ابراہیمؑ کی زبان تھی، لیکن یہ بالکل غلط ہے، حضرت ابراہیمؑ کی زبان آرامی عربی تھی، حضرت اسماعیلؑ کی بھی زبان یہی آرامی زبان تھی، (ص ۱۳۱) پھر انھوں نے عرب مورخوں کے مطابق عرب کی تمام قوموں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے: (۱) بائدہ جو امم سامیہ میں ہیں (۲) عرب عاربہ یعنی بنو قحطان (۳) عرب مستعربہ یعنی بنو اسماعیل، عرب کے یہ تینوں طبقے تین مستقل خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے، اور الگ الگ تین زبانیں بولتے تھے، لیکن یہ تینوں زبانیں گویا اپنی اصلیت کی رو سے ایک ہی ماں سے پیدا ہوئی تھیں، لیکن بعد کو

مختلف خاندانوں میں ان کی پرورش اور نشو و نما ہوئی تھی، اس لیے ان میں باہم خاص امتیازات پیدا ہو گئے تھے، (ص ۱۳۱) جس ایک ماں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ عربی زبان ہی ہے۔

اس کے بعد سید صاحب یہ بتاتے ہیں کہ امم سامیہ کے طبقۂ اولیٰ میں سب سے طاقتور قوم بنو ارم کی تھی، جس میں عاد اور ثمود بھی شامل تھے، ان کی زبان عربی آرامی ہی تھی (ص ۱۳۳) امم سامیہ کے طبقۂ دوم میں بنو قحطان تھے، ان میں جنوبی عربی کی حسب ذیل شاخیں بولی جاتی تھیں: سبائی، حمیری، حضر موتی، لہری، حبشی، سید صاحبؒ نے ان کے متعلق یہ معلومات فراہم کی ہیں: سبائی قوم سبا، حمیری اصحاب الاخدود اور حبشی اصحاب الفیل کی زبانیں تھیں، سبائی زبان بہت پہلے ختم ہو چکی تھی، بقیہ زبانیں ظہور اسلام تک بولی جاتی تھیں، لیکن قرآن کی زبان نے اپنا اثر دکھایا تو یہ زبانیں بھی ختم ہوتی گئیں، گو اپنے اپنے صوبوں میں ان کا اثر باقی رہا، حبشی تغیر زمانہ کے بعد ایک مستقل زبان بن گئی، سبائی اور حمیری میں بہت کم فرق تھا، (ص ۳۶)

اسی طرح سید صاحب یہ بھی بتاتے ہیں کہ بنو اسماعیل میں شمالی عربی کی حسب ذیل شاخیں رائج تھیں: تدمری، نبطی، حجازی، ان میں بھی الفاظ، حروف، معانی اور قواعد کا باہم فرق ہے، تدمری قرآن کی عربی زبان کے الفاظ سے بہت مغایر ہے، نبطی اصحاب الحجر کی زبان تھی، وہ قرآن کی عربی زبان سے بہت قریب ہے، اور اس کا خط بھی عربی خط بلکہ کوفی خط سے مشابہ ہے، (ص ۱۴۱ - ۱۴۰)

سید صاحبؒ کے خیال میں حجاز اور نجد میں جو عربی زبان بولی جاتی تھی، وہ سب سے بہتر تھی، ان میں بھی قبیلہ بنی سعد اور قریش کی زبان اور بھی بہتر تھی، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دو قبیلوں کے انتساب پر فخر کیا ہے، آپ قریش میں پیدا ہوئے اور بنو سعد میں پرورش پائی، پھر وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ قرآن میں دو موقع پر لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ کہا گیا ہے، جس سے مراد یہ ہے کہ قرآن ایسی زبان میں اتارا گیا ہے جو نہایت فصیح ہے، اس کے مطالب کھل جاتے ہیں، معانی واضح ہو جاتے ہیں، سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آتی (ص ۱۴۴ - ۱۴۳) پھر قریش کی عربی کی خوبی یہ بھی بتاتی ہے کہ قریش کا قبیلہ اپنی تجارت کی خاطر نہ صرف عرب کے

گوشہ گوشہ میں بلکہ آس پاس کے ممالک میں بھی جاتا تھا، اس بنا پر اس کی زبان میں دوسری زبانوں کے اعتبار سے زیادہ وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہو گئی تھی، پھر جب مکہ میں مراسم حج ادا ہوتے اور ہر گوشہ کے لوگ یہاں یکجا ہو جاتے تھے، یا جب عکاظ کا میلہ لگتا تھا، تو یہ میلہ اکاڈیمی کا کام دیتا تھا، اس بنا پر مکہ کی زبان ایسی زبان ہو گئی تھی جو عرب کی تمام زبانوں کا خلاصہ اور عطر مجموعہ تھی (ص ۱۴۶)

عربوں کے مذاہب

کتاب کے آخری دو ابواب میں اسلام سے پہلے عرب کے مذاہب اور ادیان پر بہت ہی تفصیلی معلومات ہیں جو طالبانہ اور متعصبانہ انداز میں لکھنے کے بجائے مورخانہ اور ناقدانہ انداز میں لکھے گئے ہیں ان کو قلمبند کرنے میں جہاں قرآن پاک، صحیح بخاری، مسند ابن حنبل، سیرۃ ابن ہشام، معجم البلدان یاقوت، طبقات الامم ابن صاعد اندلسی، معارف ابن قتیبہ، تاریخ مختصر الدول، الفہرست ابن ندیم، کتاب الازمنۃ والامکنۃ از امام مرزوقی، لسان العرب سے مدد لی گئی ہے، وہاں توراۃ، ہیرن کی ہسٹاریکل ریسرچ، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ، انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجس اینڈ ایتھکس، گولڈ ٹائمس آف مدین، ڈوزی کی تاریخ مسلمان اسپین میں، سورسز آف القرآن از سر ولیم میور، ہسٹری آف دی مورش امپائر، از ایس۔ پی۔ اسکاٹ اور معرکۂ مذہب و سائنس سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، اس کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ عاد، ثمود اور جرہم وغیرہ بت پرست تھے، خدائے برحق کو چھوڑ کر اور بہت سے خداؤں کو پوجتے تھے (ص ۱۴۹) سامیوں کا عام اعتقاد یہ تھا کہ تمام دنیا ارواح سے بھری ہوئی ہے، ان میں زیادہ تر ارواح خبیثہ اور کچھ ارواح طیبہ ہیں، ارواح خبیثہ کو نذر و نیاز، قربانی اور چڑھاوے سے خوش رکھنا اور ارواح طیبہ کو مدح و ثنا کا گر ان کے مقابلہ کے لیے تیار کرنا ان کا مسلک تھا، وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہر روح کا مسکن ایک ستارہ ہے، اس لیے ستارہ کی پرستش بھی کرتے (ص ۱۵۴ - ۱۵۳) مصر میں بھی سامیۂ اولیٰ کے زمانہ میں اسی قسم کی ستارہ پرستی جاری تھی، سب سے بڑا دیوتا آفتاب تھا، جس کو وہ اپنی زبان میں رع کہتے تھے، ان کے دار الحکومت میں آفتاب دیوتا کا مندر تھا، بادشاہ آفتاب دیوتا کا بیٹا سمجھا جاتا تھا، (ص ۱۵۵) آفتاب کے علاوہ مصر میں بہت سے

دیوتا اور دیویاں تھیں، ہر شہر کا ایک خاص الگ الگ دیوتا تھا، پھر ہر گھر کا الگ اور گھر کے ہر آدمی کے الگ الگ دیوتا تھے، (ص ۱۵۷) قوم سبا میں زیادہ تر آفتاب کی پوجا ہوتی تھی، (ص ۱۵۸) یمن میں آفتاب کے علاوہ ستاروں کی بھی پرستش ہوتی تھی، (ص ۱۵۹) بنو قحطان میں بتوں کی پوجا ہوتی تھی، ان کے بت خانوں کی آبادی اور مصارف کے لیے لوگ اپنی پیداوار کی کمائی کا مخصوص حصہ نذر کیا کرتے تھے، (ص ۱۶۶) بتوں پر سونا اور چاندی کی نذر چڑھائی جاتی تھی، (ص ۱۶۹) مدین بعل دیوتا کو پوجتے تھے، سامی قبائل میں بعل کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل تھی (ص ۱۷۰، ۱۶۹) مستشرقین یورپ کی تحقیق کے مطابق بعل ستارۂ زحل کا نام تھا، جس کو عربی میں ہبل کہتے تھے، اس کے لیے مذہبی قربان گاہ اور ہیکل بنے تھے، لوبان اور بخورات ان میں جلائے جاتے تھے، اونٹ کی قربانی اس کے لیے سب سے بہتر سمجھی جاتی تھی، اولاد کو بھی اس کی خاطر آگ میں ڈال دیا جاتا تھا، (ص ۱۷۱) اصحاب الایکہ میں مواب کا دیوتا کموش اور عمون کا مولک تھا، ان دونوں پر لوگ اپنی اولاد کی قربانی کرتے تھے، (ص ۱۷۲) بنو ادوم یعنی حضرت ایوبؑ کی امت سورج اور چاند کی پوجا کرتی تھی، ان کو دیکھ کر اپنے ہاتھ چوم لیتے تھے، یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اگر ممکن ہوتا تو وہ خود ان کے بوسے دیتے، (ص ۱۷۲) بنو اسمٰعیل کو جو اچھا سا چکنا پتھر مل جاتا اس کو اٹھا لیتے اور اس کو اپنے گھر کا دیوتا بنا لیتے۔ (ص ۱۷۳) اصحاب الرس اور اصحاب الحجر کے بھی بہت سے دیوتا تھے، ان کے یہاں باضابطہ ایک کاہن تھا، جو لوگوں پر مذہبی جرمانہ کر سکتا تھا (ص ۱۷۵) انباط کے یہاں چاند گھٹنے اور بڑھنے کی حالت میں دو توام دیوتا سمجھے جاتے تھے، (ص ۱۷۶) اوس اور خزرج کے گھروں میں دیوتاؤں کی مورتیں رہتی تھیں، مناۃ کی مورت لکڑی کی تراشی ہوئی یثرب کے گھروں میں اتنی بڑی تھی کہ چند آدمی مل کر اس کو اٹھاتے تھے (ص ۱۷۶) ان قبائل میں ستارہ پرستی بھی تھی، لخم اور جذام ستارۂ مشتری کو پوجتے تھے، اور طی سہیل کے پرستار تھے، (ص ۱۷۷) بنو قیدار یعنی عدنانی قبائل کا سب سے بڑا دیوتا ہبل تھا، جو خاص خانۂ کعبہ میں نصب تھا، لات کا ہیکل شہر طائف میں تھا، مکہ سے چند میل دور مقام نخلہ میں عزیٰ نام کی ایک دیوی کا مسکن تھا، ان دیوتاؤں کے لیے قربانیاں ہوتی تھیں، ان میں بعض قبائل ستارہ پرست بھی تھے، قیس شعریٰ پوجتا تھا، کنانہ چاند کا

پرستار تھا، اسد عطارد کی پرستش کرتا تھا، تمیم ستارۂ دبران پوجتے تھے، قریش اور ان کے ہم نسب قبائل کا دیوتا ہبل تھا، جو دراصل ستارۂ زحل تھا (۱۷۹) پتھر اور مٹی کی مورتوں کے علاوہ بھوت اور پریت پر بھی ان کا اعتقاد تھا، ان کو خدا یا خدا کا مقرب سمجھ کر پوجتے تھے، (ص ۱۸۰) خانۂ کعبہ میں بہت سے بت تھے، ان میں ایک خاصی تعداد رنگین تصاویر کی بھی تھی، ان میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت مسیحؑ اور حضرت مریمؑ کی بھی تصویریں تھیں، اس سے کعبہ کے یہودیوں، اسمٰعیلی عربوں اور عیسائیوں کے لیے بھی مرجع القلوب بننے کا دعویٰ سمجھا جا سکتا ہے (ص ۱۸۱)

بت پرستی کے علاوہ عرب میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ملحد اور بے دین تھے، عام مذاہب میں صابئیت، مجوسیت، یہودیت اور عیسائیت بھی تھے، صابئیت یعنی ستارہ پرستی قدیم زمانہ سے عرب میں موجود تھی، مجوسیت نے عرب پر کم اثر ڈالا، مگر بعض قبیلے اس کے پیرو تھے، یہودیت نے یہاں بڑا برگ و بار پیدا کیا، یثرب سے شام تک عرب کے اکثر مقامات یہودیوں کے قبضے میں تھے، عیسائیت شام کا شاہی مذہب تھا، لخم، جذام، عاملہ، مذحج، بہرا اور سلیح وغیرہ قبائل میں عیسائیت عام تھی، نجد کا قبیلہ طے عیسائی تھا، قریش کے خاندان بنی اسد میں چند آدمی عیسائی ہو گئے تھے۔ (ص ۱۸۲-۱۸۱)

اوپر جو کچھ اختصار سے لکھا گیا ہے اس کی پوری تفصیل 'اسلام سے پہلے عرب کے مذاہب' کے باب میں ملے گی، اس میں حیرت انگیز بات یہ پائی جاتی ہے کہ عربوں کے معبودوں کے نام، ان کے معنی، اور کن کن شہروں میں ان کی پرستش ہوتی تھی، پھر بتوں کے علٰحدہ علٰحدہ نام، بڑھنے اور گھٹنے والے چاند کے نام، ان کی کیفیت، آفتاب کی پرستش جہاں جہاں ہوتی تھی، یا مختلف دیوتاؤں اور ان کے پرستاروں کے نام جس تفحص اور تلاش سے جمع کیے گئے ہیں وہ تحقیق اور تدقیق کے بے مثال نمونے ہیں، ان کو جمع کرنے میں کوئی مذہبی عقیدہ بھی نہ تھا جس کے لیے اتنی محنت اور ریاضت کی جاتی، سید صاحبؒ میں محنت اور ریاضت فطرت ثانیہ تھی، اس کا نمونہ اس ابتدائی تصنیف میں دکھائی دیا جو آگے چل کر ان کی اور تصانیف خصوصاً سیرۃ النبی میں منتہائے کمال کو پہونچ گئی تھی، اس باب میں یہ بھی دکھایا گیا کہ ان عربوں کو سنوارنے کے لیے حضرت صالحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت لوطؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت

شعیبؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ وغیرہ بھیجے گئے، مگر انھوں نے ان کی تکذیب کی، اس لیے وہ تباہ و برباد کر دیئے گئے،

کتاب کے آخری باب میں قرآن مجید کی روشنی میں اسلام سے قبل کے عرب کے مذاہب پر مباحث ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ اوراق میں جس اعظم پرستی (یعنی ہر اس شے کی پرستش جو انسان کی نظر میں بڑی معلوم ہو) قوی پرستی (یعنی قوائے فطریہ کو معبود بنانا) اور ستارہ پرستی کا ذکر ہے، قرآن مجید نے ان سب کی مذمت کی ہے، اور ایسی تمام آیتوں کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

قرآن مجید میں عربوں کے مذاہب کا ذکر

قرآن مجید کے نزول کے وقت عرب میں متعدد مذاہب کے علاوہ مستند مذاہب میں یہودیت، نصرانیت، مجوسیت، صابئیت اور حنیفیت تھے، اور ان سب کے متعلق قرآن شریف میں جو کچھ کہا گیا ہے ان سب کو اس باب میں جمع کر دیا گیا ہے، عرب کے یہودیوں کے ذمائم اخلاق کو جس طرح کھول کر بیان کیا گیا ہے اس کا ذکر بھی ہے (ص ۱۸۸ - ۱۸۷) پھر عیسائی تین خدا کو مانتے ہیں قرآن مجید میں اس کی تردید کی گئی ہے، (ص ۱۸۹) مجوسی یزدان اور اہرمن دو خداؤں کے قائل تھے، ایک فاعل خیر (یزدان) دوسرا فاعل شر (اہرمن) تھا، یزدان کو نور اور اہرمن کو ظلمت سے تعبیر کرتے تھے، قرآن مجید نے اس مجوسی اعتقاد کا جس طرح ابطال کیا ہے اسی کا ذکر کیا گیا ہے، صابئیت کا ذکر نسبۃً زیادہ تفصیل سے ہے، اس کے متعلق قرآن شریف، حافظ ابن کثیر کی تفسیر، علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن حزم کی تحریروں میں جو کچھ ہے، یا ان کے متعلق قدیم عیسائیوں اور علمائے یورپ کے جو بیانات ہیں ان سب کو اس میں جمع کر دیا گیا ہے، پھر سید صاحبؒ خود اس پر اپنا تبصرہ کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ صابئین کا اصل مولد بابل تھا، (ص ۱۹۳) یہ کلدان کے قدیم مذہب ستارہ پرستی، یونان کے فرقہ ناسنگ اور ایران کے مسئلۂ نور و ظلمت کا ایک مخلوط مجموعہ ہے، (ص ۱۹۰) ان مباحث میں صابی کی لغوی تحقیق بھی کی گئی ہے، اور اس کے مختلف معنے بتائے گئے ہیں، ایک تو یہ کہ عربی لفظ صبغ کے ہم معنی ہے جس سے عربی میں اصطباغ ہے، اس کے اصلی معنی نہانے اور دھونے کے ہیں، اور اصطلاحاً بپتسمہ کے معنی میں بولا جاتا ہے

چونکہ یہ فرقہ مذہباً دن میں کئی مرتبہ غسل کرتا ہے اس لیے ان کا آرامی نام صابی پڑا، اور اسی سے عربی میں آیا، ایک اور لغوی تشریح یہ ہے کہ سامی زبانوں میں لفظ ستاروں کے مفہوم میں عام طور سے مستعمل ہے، عبرانی میں اس کے معنی جماعت ستارگان کے ہیں، عربی میں صبا کے معنی ستارے کے طلوع اور نکلنے کے ہیں، چنانچہ قاضی بیضاویؒ نے صابی کا اشتقاق اسی لفظ سے کیا ہے، ان مباحث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خود صابئین پہلے اپنے لیے یہ اصطلاح استعمال نہیں کرتے تھے، لیکن خلیفہ مامون رشید کے عہد سے یہ لقب استعمال کرنے لگے، عباسیوں کے دور میں ان کا عروج ہوا تو انھوں نے اپنے کو اہل کتاب ثابت کرنے کی بھی کوشش کی، اور اپنے مذہب کی ایسی تجدید و اصلاح کی کہ وہ اپنے کو اسلام کے قریب تر ثابت کرنے لگے، اسی لیے بعض علمائے اسلام نے ان کے عقائد و طرز عبادت کو اسلام سے قریب تر بیان کیا ہے، لیکن ان مباحث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں ان کی ستارہ پرستی کا الزام ہے، ان کی ستارہ پرستی کی تردید میں حضرت ابراہیمؑ کا وہ مکالمہ ہے جو انھوں نے ستارے، چاند اور آفتاب سے کیا ہے، (ص ۵ - ۲۰۴) قرآن ہی سے ظاہر ہے کہ صابی قوم کی ہدایت و اصلاح کے لیے سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ مامور ہوئے، اور قرآن ہی سے یہ ثابت کر دکھایا گیا ہے کہ وہ نہ یہودی تھے، نہ عیسائی، بلکہ موحد مسلم تھے، مشرکوں میں نہ تھے، (ص ۲۱۴) قرآن سے یہ بھی ظاہر ہے کہ ان میں ارواح اور ملائکہ پرستی کا بھی رواج تھا، (ص ۲۰۸)

اس کے بعد مذہب حنیف کی تصریح بڑی تفصیل سے کی ہے، اس سے مستشرقین کی بعض تلبیسات اور تدلیسات کا پول بھی کھل جائے گا، لکھتے ہیں کہ حنیف حنف سے مشتق ہے، عربی میں اس کے معنی مڑنے اور جھکنے کے ہیں، اس لیے حنیف وہ شخص ہے جو ایک طرف سے جھک کر اور مڑ کر دوسری طرف جائے، یہ لفظ اچھے اور برے دونوں معنوں میں مستعمل ہو سکتا ہے، اگر یہ فرض کیا جائے کہ اس نے اچھی بات کو چھوڑ کر بری بات اختیار کی تو حنیف کے وہ معنی ہو سکتے ہیں جس میں عبرانی و سریانی میں وہ مستعمل ہے، یعنی کافر و منافق، اور اگر یہ سمجھا جائے کہ برے کام کو ترک کر کے اس نے کوئی اچھا کام پسند کیا ہے تو اس کا وہ مفہوم ہوگا جس میں اہل عرب اس کو بولتے ہیں، یعنی دیندار اور خدا پرست، اس بنا پر اس لفظ کے اچھے یا برے مفہوم کی تحقیق موقع استعمال اور حرف صلہ سے ہوگی،

اصل میں اس کا ابتدائی استعمال اللہ یا الدین کی تخصیص کے ساتھ ہوتا تھا، یعنی الحنیف للہ خدا کی طرف جھکنے والا، الحنیف للدین سچے مذہب کی طرف جھکنے والا، کثرت استعمال اور زبان زدگی عام سے اس قید کی ضرورت نہ رہی، اور مطلق حنیف (جھکنے والا) کے معنی بھی حنیف للہ (خدا کی طرف جھکنے والا) یا حنیف للدین (سچے مذہب کی طرف جھکنے والا) ہی کے سمجھے جانے لگے، چنانچہ قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال دونوں طرح سے ہوا ہے، سورۂ حج میں حنفاء للہ (خدا کی طرف مڑنے والے بن کر) لیکن سورۂ بینہ میں بغیر صلہ کے آیا ہے: مخلصین لہ الدین حنفاء (اپنے اعتقاد کو خدا کے لیے خالص کر کے مڑنے والے بن کر) یہاں حنفاء کے معنی حنفاء للہ سمجھے جائیں، (ج ۲، ص ۲۰۸) اس کے بعد سید صاحب لکھتے ہیں کہ حنیف، حنف سے مشتق ہے، حنف کے معنی ہٹنے اور ٹیڑھے ہونے کے ہیں، (ص ۲۰۸) جب حضرت ابراہیمؑ کی بعثت صابی قوم کے اندر ہوئی تو انھوں نے دلائل اور عمل دونوں طریقوں سے ان کے مذہب کی تردید کی، باطل پرستوں سے سخت تنفر ظاہر کیا، اور خدائے برحق پر ایمان لائے، اسی بنا پر انھوں نے خود یا بعد کو ان کے پیروؤں نے اپنا لقب حنیف اختیار کیا، یعنی ستارہ پرستی وغیرہ سے مڑ کر خدا پرستی کی طرف آنے والا، (ص ۲۱۱)

اس کے بعد شرک کا ذکر ہے، جو عرب کا سب سے وسیع الاثر مذہب تھا، اس کے معنی یہ بتائے گئے ہیں کہ ایک خدا کو مان کر اس کی اعانت و امداد کے لیے اس کے اعوان و انصار کا یقین رکھا جائے، مشرکین کے عقائد کی تفصیل قرآن کی آیتوں کے ذریعہ سے لکھی گئی ہے، ان کو اس بات کی چڑھ تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کا نام کیوں لیتے ہیں، (ص ۲۱۸) فرشتوں کے متعلق ان کا اعتقاد یہ تھا کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، اسی لیے ان کو عورت فرض کرتے تھے، (ص ۲۱۹) وہ بھوت پریت اور جنات کے بھی قائل تھے، ان کو خدا یا خدا کے ہم پایہ سمجھتے تھے، ان کی دہائی مانگتے تھے، اور ان کے غضب سے ڈرتے تھے، (ص ۲۲۰) ان کو حشر و نشر کے اعتقاد اور رسالت و نبوت سے سخت انکار تھا، ان کو تعجب ہوتا تھا کہ کیا مر کر بھی کوئی جی سکتا ہے، اور آدمی ہو کر بھی کوئی خدا کا فرستادہ بن سکتا ہے، (ص ۲۲۱) قرآن مجید سے ان اعتقادات کی تردید و ابطال میں آیتیں جمع کر دی گئی ہیں۔

عربوں کے بت

قرآن مجید میں جن بتوں کا ذکر آیا ہے، ان کے نام بھی ان مباحث میں جمع کر دیے گئے ہیں، اور وہ یہ ہیں: لات، عزیٰ، مناۃ، ہبل، ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر، اور ان کے پرستار قبائل کے نام بھی لکھ دیے گئے ہیں، لات اور عزیٰ قریش کے دیوتا تھے، مناۃ کو اوس و خزرج سے خصوصیت تھی، ود قبیلۂ کلب کا بت تھا، سواع کی پرستش ہذیل کرتے تھے، یغوث مراد اور بنی غطیف کے قبیلوں کا دیوتا تھا، یعوق ہمدان میں پوجا جاتا تھا، نسر حمیر کے خاندان ذی الکلاع کا معبود تھا، ہبل کی پرستش شام میں ہوتی تھی (ص ۲۲۵)

پھر ان تمام بتوں کے ناموں کی لغوی اور معنوی تحقیق بہت ہی عالمانہ انداز میں کی گئی ہے، کتاب کا خاتمہ یہ لکھ کر کیا گیا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ عرب میں دو متضاد جماعتیں تھیں، جن میں ایک اپنے معبود کو اللہ اور دوسری الرحمٰن کہتی تھی، اسلام ان دونوں کو یکجا کرتا ہے کہ تم جس کو اللہ کہتے ہو اور وہ جس کو رحمٰن کہتے ہیں، درحقیقت ایک ہی ذات کی دو تعبیریں ہیں، اور یہ باہمی اختلاف محض نزاع لفظی ہے، اس بنا پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے معنی ہمارے نزدیک یہ ہیں: ہم اپنا کام اس خدا کے نام سے شروع کرتے ہیں جس کا دوسرا نام رحمٰن ہے، اور جو رحمت والا ہے، (ص ۲۳۳)

ارض القرآن کی اہمیت اور افادیت پر ایک نظر

اس کتاب کی اہمیت اور افادیت اور پھر اس کی نوعیت پر تبصرہ کرنا راقم جیسے کم سواد کے بس کی بات نہیں پھر بھی یہ کہنے میں تامل نہیں کہ یہ حضرت سید صاحبؒ کی پہلی تصنیف ہے، لیکن اس کے عرض ہنر میں اب تک ان کا کوئی حریف نہ ہو سکا، جس محنت اور ریاضت سے یہ لکھی گئی ہے اردو زبان کیا، بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی ایسی کتاب کم لکھی گئی ہوگی، ان کی ابتدائی علمی زندگی میں ان کے استاد محترم علامہ شبلی نعمانیؒ نے ان کو نصیحت کی تھی کہ معلومات اور مواد کو ہر گوشہ اور ہر گوشے سے اس محنت سے ڈھونڈو کہ پھر کوئی گوشہ خالی نہ رہ جائے، اس عنوان پر اگر پہلے کسی نے کچھ لکھا ہو تو اس سے تمہارا مضمون بالکل الگ رہے، یا اس سے بڑھ جائے، مستند حوالہ کے بغیر کوئی واقعہ نقل نہ کیا جائے، معنی کے ساتھ عبارت کی چستی، طرز ادا کی شگفتگی اور تشبیہ و استعارہ کی ندرت ہاتھ سے نہ جانے،

پامال معلومات، مبتذل محاورات اور عامیانہ الفاظ سے پوری طرح پرہیز کیا جائے۔ (معارف جولائی ۱۹۵۱ء)

اس معیار پر تاریخ ارض القرآن بعض حیثیتوں سے پوری اترتی ہے، البتہ یہ دیکھنا ہے کہ اس میں عبارت کی چستی، طرز ادا کی شگفتگی اور تشبیہ و استعارات کی ندرت ہے کہ نہیں؟ مولانا شبلیؒ نے جو باتیں کہی تھیں، سید صاحبؒ نے ابن خلکان کے مطالعہ سے بھی حاصل کی تھیں، جس سے وہ آخر زندگی تک اپنے استاد ہی کی طرح متاثر رہے، رسالہ الندوہ کے دو شماروں (اکتوبر، نومبر ۱۹۰۶ء) میں ابن خلکان اور تاریخ ابن خلکان پر ایک مضمون میں اس کی خصوصیات بتائیں کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے بڑی محنت سے لکھتا ہے، کسی کتاب سے کوئی عبارت نقل کرتا ہے تو ایک لفظ کی کمی بیشی کو گناہ سمجھتا ہے، وہ اپنے ماخذوں کا بھی ذکر کرتا جاتا ہے وہ روایت پر بالکل اعتماد نہیں کرتا، بلکہ درایت سے بھی کام لیتا ہے، جو باتیں خلاف عقل ہوتی ہیں ان کو بالکل نہیں چھوتا، اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی عبارت میں لطافت اور بیان میں حسن ہوتا ہے، ابن خلکان کی یہ خصوصیات سید صاحبؒ کے ذہن پر ارض القرآن قلمبند کرتے وقت چھائی رہیں، لیکن اس کا مطالعہ بھی ضروری ہے کہ ابن خلکان کے بیان کے مطابق اس کی عبارت میں لطافت اور بیان میں حسن ہے کہ نہیں، لیکن پہلے ارض القرآن کی نوعیت کا مطالعہ ضروری ہے۔

اس کو پڑھتے وقت یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس میں آخر سید صاحبؒ کا جلوہ کس حیثیت سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے، کیا وہ علم القرآن یا علم التاریخ یا علم الجغرافیہ یا علم آثار قدیمہ و کتبات کے ماہر دکھائی دیتے ہیں، بنیادی طور پر تو وہ علم القرآن کے ماہر رہے، ان کو قرآن مجید سے عشق تھا، اسی عشق کی بنیاد پر انھوں نے ارض القرآن کی قوموں کو اپنا محبوب موضوع بنایا، اور اپنی تحقیقات کا پورا جوہر دکھا دیا، اسی کے ساتھ اس کتاب کے لکھنے میں ان کا اہم ترین مقصد یہ بھی تھا کہ قدیم و جدید معلومات کی تطبیق کے ساتھ ارض القرآن کے حالات کی اس طرح تحقیق ہو کہ قرآن مجید کی صداقت اور معترضین کی لغزش علی الاعلان آشکارا ہو جائے (ج ۱، ص ۲) اس مقصد کو پورا کرنے میں وہ شروع سے آخر تک بہت ہی مستند اور بلند پایہ مورخ کی حیثیت سے نمایاں ہوئے ہیں، انھوں نے

اس میں قرآن مجید کی آیتیں بکثرت نقل کی ہیں، ان کا مطالعہ کرتے وقت یہ حیرت ہوتی ہے کہ لوگ قرآن مجید کو پند و موعظت اور عبرت و بصیرت کا محض صحیفہ سمجھتے ہیں، لیکن سید صاحبؒ نے اس کو تاریخ و سیر کا ایک بہت ہی اہم ماخذ بنا دیا ہے، قرآن مجید کے ساتھ زبور، تورات، انجیل اور پھر یونانی اور یورپی اور عرب مورخوں کی تصانیف، جغرافیہ کی کتابوں اور آثار قدیمہ کے انکشافات اور کتبات کو جس طرح استعمال کیا ہے، اور ان سے جو تاریخی نتائج استنباط کیے ہیں، وہ تلاش، تجسس اور تفحص کے اعلیٰ نمونے ہیں، پھر اسی کے ساتھ اس میں ان کے بصرانہ اور ناقدانہ نظر و فکر کے بھی کرشمے دکھائی دیتے ہیں، کبھی وہ قرآن کے مفسروں سے اختلاف کرتے ہیں کبھی زبور، تورات اور انجیل کے واقعات پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں، کبھی یونانی اور رومی مورخوں کے بیانات کو تسلیم کرنے میں ہچکچاتے ہیں، کبھی عرب جغرافیہ دانوں کے بیان کو زیر بحث لاتے ہیں، کبھی مختلف عرب مورخوں کے بیانات کا موازنہ کر کے اپنی کوئی خاص رائے قائم کرتے ہیں، اس جگہ کا دی کے بعد انھوں نے اس سرزمین کی قوموں کی اور قبیلوں کی تاریخ مرتب کر دی ہے، جہاں قرآن مجید کا نزول ہوا، ان کی یہ تصنیف زیادہ تر ارض القرآن کے نام سے مشہور ہوئی، حالانکہ اس کا نام تاریخ ارض القرآن رکھا گیا ہے، ارض القرآن سے بظاہر یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ شاید علوم قرآن جیسی چیزوں سے متعلق اس میں کچھ لکھا گیا ہو، لیکن یہ دراصل تاریخ ارض القرآن ہے، جو خالص مورخانہ نقطۂ نظر سے لکھی گئی، قرآن کی سرزمین کی جن قدیم قوموں اور قبیلوں کو بھلا دیا گیا تھا، ان کی یاد اس کتاب میں پھر سے دلا دی گئی ہے، ان کی تاریخ لکھنے میں ہر قبیلے کے نام کی تصریح کی گئی ہے، اس کا زمانہ متعین کیا گیا ہے، اس کی سیاسی تاریخ لکھی گئی ہے، اس کا دائرۂ حکومت بتایا گیا ہے، اس کے فرماں رواؤں کے نام اور تعداد کی بھی حتی الوسع وضاحت کی گئی ہے، ان فرماں رواؤں کے نام تلاش کرنے میں جو دقتیں ہوئی ہیں ان کی بھی تفصیل بیان کی گئی ہے، پھر ان کے مذاہب اور عقائد کی تفصیل ہے، اس میں ان کے بتوں اور معبودوں کی جو تصریح کی گئی ہے اس کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کی تلاش میں کیسی عرق ریزی کی گئی ہے، پھر ان کی مختلف زبانوں کی تفصیلات لکھ کر سید صاحبؒ نے اپنے کو بہت بڑا زبان دان بھی ثابت کر دکھایا ہے، ان قبیلوں کے زوال

اور تباہی کے کیا اسباب ہوئے، اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس حیثیت سے تو سید صاحبؒ اقوام، ان کے ادیان اور ان کی زبانوں کے بہت بڑے مورخ نظر آتے ہیں، ان کی زبانی بارہا سنا کہ مولانا شبلیؒ تاریخ و ادب کو کوئی فن نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اپنے علمی دسترخوان کے سنگین کھانوں کے ساتھ ان کو ذائقہ تبدیل کرنے کے لیے چٹنی سمجھتے تھے، مگر یہ عجیب بات ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے جب کوئی تاریخی چیز لکھی تو یہ چٹنی شاہجہانی اور نورتن چٹنی سے زیادہ لذیذ بن گئی، یہ دونوں بزرگ اپنے علم و فضل کی بصیرت سے کوئی غیر تاریخی چیز بھی لکھتے تو ہمیں بھی تاریخی رنگ پیدا کر دیتے، تاریخی پس منظر پیش کرنا، تاریخی مسائل کی گتھیوں کو سلجھانا، تاریخی نتائج کا استنباط کرنا، ان کی علمی فطرت ثانیہ بن گئی تھی، اسی لیے آگے چل کر اپنی تصنیفی زندگی کی رنگا رنگی میں سید صاحب ایک جید مورخ بھی تسلیم کیے گئے، لیکن ان کو اپنی تاریخ نویسی میں بادشاہوں کی تاریخوں سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی، وہ صرف تاریخ ہی لکھتے رہتے تو مسلمان بادشاہوں کی تاریخ کے بجائے اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ لکھتے، تاریخ نویسی کے سلسلہ میں ان کے موضوعات کی نوعیت اور مورخوں سے الگ ہوتی، اور ہوئی، ان کے قلمبند کیے ہوئے تاریخی مضامین کے کچھ عنوانات یہ ہیں، مثلاً مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کی علمی ترقی کی تاریخ، ہندوستان میں اشاعت اسلام کی تاریخ، تاج محل اور لال قلعہ کی تعمیر کی تاریخ، اور پھر عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہازرانی کی تاریخ لکھ کر تو اپنی تاریخ نویسی کے معیار کو سدرۃ المنتہیٰ بنا دیا، یہ موضوعات دلچسپ ہیں، ان پر لکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں، لیکن عرب کی بھلائی قوموں پر تحقیق کرنا تو بہت صبر آزما تھا، سید صاحبؒ اپنی صبر آزمائی میں پورے اترتے نظر آتے ہیں، ان کو پڑھنا تو اپنے صبر و استقلال کو آزمائش میں ڈالنا ہے، پھر ان پر لکھنا تو صبر اور استقلال کا بے مثال نمونہ پیش کرنا ہے، اس حقیر راقم نے گذشتہ صفحات میں جو تاریخ ارض القرآن کی دونوں جلدوں کی خاص خاص باتیں خلاصہ کے طور پر پیش کی ہیں، ان کو سمیٹ کر قلمبند کرنے میں راقم کو جتنی مشکلیں پڑتی گئیں، اس سے اس کتاب کے لکھنے میں سید صاحب کی جانکاہ محنت، جگر گسل ریاضت اور قلم کی طاقت کا اندازہ ہوتا گیا۔

ان خلاصوں سے اس کا اندازہ ہوا ہوگا کہ یہ کتاب شروع سے آخر تک تحقیق اور رد تحقیق کے انبار سے لدی ہوئی ہے، جہاں ان کی اپنی تحقیقات ہیں، وہاں دوسروں کی تحقیقات سے ان کو جو اختلاف ہوا ہے، اس کو وہ رد بھی کرتے جاتے ہیں، اس میں امم سامیہ عاد، ثمود، طسم و جدیس، شاہان معین، بنی لحیان، بنو قحطان، سبا کی شاخیں، ملوک سبا، جنت سبا، تبابعہ کے نام اور زمانے، بنو قطورا، بنو سارہ، بنو ہاجرہ، بنو ادوم، بنو اسمٰعیل، ہشام، ادبائیل، مشماع، یطور، تیما، اصحاب الحجر، آل غسان، انباط، آرامی زبان کی حقیقت، امم بائدہ کی آرامی زبان، قحطانی زبانوں، ثمود کی زبان، لسان عربی مبین وغیرہ عنوانات پڑھ کر گھبراہٹ ہوتی ہے، لیکن سید صاحبؒ نے ان کو اپنے لیے دلچسپ موضوعات بنا کر اپنی تحقیق و تدقیق کی لالہ کاری دکھادی ہے، اس کتاب کے ہر صفحہ پر کچھ نہ کچھ نئی بات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جگہ ہو، کوئی تاریخی واقعہ ہو، کسی زبان کا کوئی لفظ ہو، کسی شخص کا نام ہو، یا کوئی متنازعہ فیہ واقعہ ہو ان سب کی تحقیق اور وضاحت کے لیے رکے ہیں، اور ان کو واضح کر کے آگے بڑھے ہیں، ایسی بہت سی مثالیں ہیں، لیکن نمونہ کے طور پر ہم ایک ایک مثال یہاں پر ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں،

عربؔ کے نام کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علمائے انساب کہتے ہیں کہ اس ملک کا پہلا باشندہ یعربؔ بن قحطان تھا، جو یمنی عربوں کا پدر اعلیٰ ہے، اس لیے اس ملک کے باشندوں اور نیز اس ملک کو عرب کہنے لگے، لیکن یہ بالکل خلاف قیاس اور معلومات تاریخی کے مخالف ہے، نہ یعربؔ اس ملک کا باشندہ تھا اور نہ لفظ عرب کسی قاعدۂ لسانی کے موافق یعرب کی طرف منسوب ہو سکتا ہے، اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ یعرب کا مسکن یمن تھا، اس لیے سب سے پہلے خود یمن یعنی جنوبی عرب کو عرب کہنا چاہیے، لیکن اس کے بالکل برخلاف عربؔ کا لفظ پہلے شمالی عرب کے لیے استعمال ہوا، اہل جغرافیہ کہتے ہیں اور بالکل صحیح کہتے ہیں کہ عربؔ کا پہلا نام عَرَبَۃ اور عربۃ تھا جو تخفیفاً بعد کو عرب بولا جانے لگا، اس کے بعد ملک کے نام سے خود قوم کا نام بھی قرار پا گیا، چنانچہ شعرائے عرب کے اشعار سے بھی جو عرب کی تنہا ڈکشنری ہے اس کی تصدیق ہوتی ہے،

اس کے بعد عربی شعراء میں اسد بن جاحل بن منقذ ثوری، ابوسفیان اور ابوطالب بن عبدالمطلب کے اشعار نقل کیے گئے ہیں، اس کے بعد خود یہ سوال پوچھتے ہیں کہ اس ملک کا نام عربہ کیوں قرار پایا ہے؟ اس کا جواب خود دیتے ہیں کہ اصل یہ ہے کہ تمام سامی زبانوں میں عرب صحرا اور بادیہ کا مفہوم رکھتا ہے، عبرانی میں عربا بیابان اور میدان کو کہتے ہیں، اور خود عربی زبان میں اس مفہوم قدیم کے بقایا موجود ہیں، عرابۃ کے معنی بدویت کے ہیں، اور اعراب اہل بادیہ اور صحرانشینوں کے لیے اب تک مستعمل ہے، چونکہ عرب کا ملک زیادہ تر ایک بیابان بے آب وگیاہ ہے، اور خصوصاً وہ حصہ جو حجاز سے بادیۂ عرب وشام اور سینا تک پھیلا ہوا ہے، اس لیے اس کا نام عربا قرار پایا، اور پھر رفتہ رفتہ وہاں کے باشندوں کو عرب کہنے لگے، (ج ۱، ص ۵۸-۵۷)

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ملکۂ سبا کا تخت اپنے دربار میں اٹھوا منگوایا تھا، اس پر مختلف حیثیتوں سے بحث کرکے سید صاحبؒ نے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اس کو اٹھا نہیں منگوایا تھا، بلکہ ملکۂ سبا جب حضرت سلیمانؑ کے پاس آئی تو اپنے ساتھ تحفہ کے طور پر ایک تخت لائی، جو سبا کی دستکاری کا اعلیٰ نمونہ تھا، پھر قرآن مجید میں ہے کہ ایک درباری نے جو کتاب سے واقف تھا عرض کی کہ میں نگاہ پلٹنے سے پہلے ملکہ کا تخت اٹھا لاتا ہوں، سید صاحبؒ کے خیال میں نگاہ پلٹنے سے پہلے سے مراد سرعت اور جلدی ہے، اس سے نگاہ پلٹنے کے ساتھ کام ہو جانا مقصود نہیں، پھر اس پر بحث کی ہے کہ کتاب سے کیا مراد ہے، عام مفسرین توراۃ یا اسم اعظم مراد لیتے ہیں، لیکن سید صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ توراۃ کے علم سے تخت کا جلد اور بسرعت لے آنا کیا مناسبت رکھتا ہے، اسم اعظم یہودی تخیل میں جادو منتر کی کوئی سریع التاثیر چیز ہے، جو اسلام میں نہیں، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ایک مدعی کلام جدید کا خیال ہے کہ کتاب سے مراد رجسٹر اور دفتر ہے، سید صاحبؒ اس کو مضحکہ خیز یہ لکھ کر قرار دیتے ہیں کہ اس عہد میں بیسویں صدی کی طرح باقاعدہ دفتر اور رجسٹر نہ تھا، سید صاحبؒ کی رائے ہے کہ کتاب سے خط مراد ہے، کیونکہ لفظ کتاب بمعنی خط عربی میں عام طور سے استعمال ہے، بلکہ فصحاء اس کے سوا کوئی دوسرا لفظ استعمال نہیں کرتے، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ میری

تاویل یہ ہے کہ درباریوں میں ملکۂ سبا کے مضمون خط کا جس کو علم تھا کہ وہ بطور تحفہ اپنے ساتھ ایک تخت لائی ہے، اس نے کہا میں ابھی لاتا ہوں، اس سلسلہ میں کتاب بمعنی خط کی تائید میں قرآن کی آیتیں بھی نقل کی ہیں، (ص ۶۶-۲۶۵) اس ضمن میں یہ بحث بھی آگئی ہے کہ قرآن مجید میں ہے کہ ملکۂ سبا حضرت سلیمانؑ کے ہاتھ پر اسلام لائی، اور پیغمبرانہ جاہ وجلال دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھی اسلمتُ مع سلیمان، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ بظاہر بیبیم یعنی توراۃ سے اس کی تائید نہیں ہوتی لیکن اسی سے ملکہ کے یہ فقرے بھی نقل کرتے ہیں کہ خداوند تیرا خدا مبارک ہو جو تجھ سے راضی ہے اور جس نے تجھ کو اسرائیل کے تخت پر بٹھایا، کیونکہ خداوند اسرائیل کو ابد تک پیار کرتا ہے، اور تجھ کو بادشاہ بنایا کہ عدل وانصاف کرے، ان فقروں کو نقل کرکے سید صاحبؒ پوچھتے ہیں کہ کیا یہ اس کے ایمان قلب کو نہیں ظاہر کرتے (ج ۱، ص ۶۷-۲۶۶)

حمیر کے جیسے لفظ کی پوری تحقیق اس طرح کی گئی ہے کہ علمائے انساب کہتے ہیں کہ حمیر سبا کے جانشین فرزند کا نام تھا، اس لیے سبا کی تمام تاریخ میں وہ بجائے سبا کے ہر جگہ حمیر بولتے ہیں، لیکن اب تک جو کتبات ملے ہیں اور جن میں سے اکثر کی عبارتیں میری نظر سے گزری ہیں ان میں لفظ حمیر کہیں نظر نہیں آیا، خود حمیر کے سلاطین اپنے آپ کو ملک ذوریدان لکھتے ہیں، ہاں اہل حبش کے کتبات میں حمیر اور ارض حمیر البتہ کہیں کہیں ملتا ہے، حمیر عربی اور حبشی میں حمر سے مشتق ہوگا، جس کے معنی سرخ کے ہیں، اور محاورہ میں گورے رنگ کو احمر کہتے ہیں، اس کا مقابل اسود ہے، عرب سیاہ وسپید کی جگہ الاسود والاحمر بولتے ہیں، چونکہ اہل حبش کالا سود اور اسودان کہتے ہیں، اس کے مقابل میں حبش عربوں کو حمیر یعنی گورے رنگ کے آدمی کہتے ہوں گے،

(ج ۱، ص ۲۷۴)

لقمان کون تھا؟ اس کی تصریح جس طرح کی گئی ہے وہ بھی لائق مطالعہ ہے، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ روایات عرب میں ایک شخص لقمان مشہور ہے، جس کو لوگ اب عموماً حکیم لقمان کہتے ہیں، اس کی طرف حکایات وتمثیلات حکیمانہ کثرت سے منسوب ہیں، قرآن میں بھی لقمان کا تذکرہ اور اس کے بعض نصائح کا

حوالہ ہے، ہم ان دونوں کو ایک ہی سمجھتے ہیں، سید صاحبؒ نے اپنے اس بیان کی تصدیق مشہور مورخ ابن اسحٰق کے بیان سے کی ہے، جس کی سیرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں قدیم ترین تصنیف ہے (ج۱، ص ۱۷۸) پھر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ عام لوگ غلطی سے لقمان عاد اور لقمان حکیم کو دو سمجھتے ہیں، عرب کے افسانہ گو کہتے ہیں کہ لقمان حکیم افریقی الاصل تھا، اور ایک غلام کی حیثیت سے عرب میں آیا تھا، بعض علمائے یورپ حکیم لقمان اور ایساپ نامی ایک یونانی حکیم کو ایک قرار دیتے ہیں، اس اتحاد کی جو دلیل پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ان دونوں کی طرف جو حکایات و تمثیلات منسوب ہیں وہ تقریباً ایک ہی قسم کے ہیں، لیکن یہ ایک تعجب انگیز استدلال ہے، کسی دو تصنیف کے مطالب کا اتحاد ان کے مصنفین کے اتحاد شخصیت کو اگر مستلزم ہے تو افسوس ہے کہ اس جرم میں سینکڑوں تاریخی اشخاص کے مٹ جانے کا افسوس ہوگا، (ج۱، ص ۱۷۹)

سید صاحبؒ نے اپنی اس کتاب میں عرب کے مختلف قبیلوں کے علیحدہ علیحدہ طبقات قائم کرکے ان کے زمانے اور دائرۂ حکومت کی تعیین کرکے بہت سے خلط ملط واقعات کی تصریح کردی ہے، ان میں سے بعض کے زمانے کی تعیین نہیں ہوسکی تھی، لیکن سید صاحبؒ نے تقریباً سب کے زمانہ کی تعیین کرکے بہت سے متنازعہ فیہ واقعات کو حل کردیا ہے، وہ کس طرح اس کی تصریح کرتے ہیں، اس کی مثال یہ ہے:

"آج کل عموماً تسلیم کیا جاتا ہے کہ بنو سام کی حقیقی ترقی کا عہد ۲۲۰۰ ق م ۲۰۰۰ ق م ہے، سامی اقوام کے حملۂ مصر و بابل کی بھی یہی تاریخ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عاد ارم کا وجود ۲۲۰۰ ق م سے شروع ہوتا ہے، انتہائے مدت تک کی تعیین کی یہ صورت ہے کہ پندرہ سو ق م میں یمن میں ایک دوسری قوت کا ظہور معلوم ہوتا ہے، اور اس سے کچھ ہی پہلے حضرت موسیٰؑ کا زمانہ ہے، حضرت موسیٰؑ کے عہد سے عاد کی تباہی عام ہوچکی تھی، قرآن مجید نے نقل قصص میں ہمیشہ عاد کا ذکر حضرت موسیٰؑ و فرعون سے پہلے کیا ہے..... ان وجوہ سے عاد کی عظمت اور ترقی کا زمانہ ۲۲۰۰ ق م سے ۱۷۰۰ ق م تک ہوسکتا ہے، لیکن عاد کا وجود اس کے بعد بھی ابتدائے عہد مسیح تک باقی رہا ہے، اور یونانیوں نے ادعادیہ مثلاً (عاد ارم) اور عادائیٹ (عاد) کے نام سے

ان کا ذکر حضرموت اور یمن کے باشندوں میں کیا ہے، تمیز کے لیے عہد اول کو عاد اولیٰ اور عہد ثانی کو عاد ثانیہ کہتے ہیں، (ج۱، ص ۱۳۰ - ۱۲۹)

سید صاحبؒ نے قدیم قبیلوں کی تاریخ اور ان کے زمانے کی تعیین کرنے کے لیے چند اصولوں کی طرف بھی توجہ دلائی ہے، جن کا مطالعہ آج بھی مفید ہے، وہ لکھتے ہیں کہ جدید طرز تاریخ کی رو سے نہایت ضروری ہے کہ قبائل کے زمانہ کی بھی تعیین کی جائے، لیکن یہ نہایت مشکل کام ہے، عموماً کسی مجہول العہد قوم کی تعیین زمانہ کی یہ صورت اختیار کی جاتی ہے کہ اس کے معاصر معلوم العہد قوم یا شخص کے زمانہ سے اس کا قیاس کیا جاتا ہے، دوسرا اصول یہ ہے کہ عموماً چار پشتوں کی ایک صدی فرض کرکے پشتوں کے شمار سے زمانہ کی تعیین کرلی جاتی ہے، لیکن یہ ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ کسی قوم کے وجود کی تاریخ اور اس کی شہرت اور ناموری کی تاریخ دونوں دو چیزیں ہیں، یہ ضروری نہیں کہ اگر ایک قوم کی شہرت کا ایک زمانہ ہو تو وہی اس کے آغاز وجود کا بھی ہو، فلسفۂ تکوین اقوام کی وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ قوم کے آغاز وجود کا زمانہ اس کے زمانۂ ارتقاء و شہرت سے سینکڑوں ہزاروں برس پیشتر ہو، کہ ایک فرد کنبہ بن سکے، اور ایک کنبہ قوم، ایک اور چیز جس سے کسی قدیم قوم کی جائے سکونت اور قومیت کی نوعیت کی تحقیق میں بڑی مدد مل سکتی ہے وہ تاریخی اشخاص، ان کے مقامات سکونت، ان کی زبان اور دیوتاؤں کے ناموں کے باہمی تطابق، اشخاص و مقامات کے ناموں کا باہمی تطابق ان اشخاص کے مقامات سکونت کا پتہ دیتا ہے، اور دو قوموں کی زبان اور ان کے باہمی اسماء کا تطابق ان کے اتحاد قومیت کی طرف اشارہ کرتا ہے" (ج۱، ص ۵۲ - ۵۱) مگر ان اصولوں کے اجراء میں سید صاحبؒ کو کچھ دقتوں کا بھی احساس تھا، ایک تو یہ کہ زمانہ کے امتداد اور قوموں کے انقلابات اور زبانوں کے تغیر سے نام کچھ سے کچھ ہوگئے ہیں، اس لیے مقامات اور باشندوں کے ناموں میں تطابق کے بجائے صرف تشابہ پر قناعت کرنی پڑتی ہے، دوسری دقت جو پہلے سے سہل تر ہے، یہ ہے کہ سامی زبان میں باہم اور نیز یونانی زبانوں میں جس میں توراۃ کا قدیم ترجمہ ہے اور اب زیادہ تر وہی پھیلا ہوا ہے، جب ایک نام ایک زبان سے منتقل ہوتا ہے تو بعض حروف کا مبادلہ خصوصیت زبان کی وجہ سے

ہوجاتا ہے، مثلاً ابجر اور ہاجر، پاران، باران اور فاران، اسمائیل اور اسماعیل، ثہمود اور ثمود، عیشا اور عیسیٰ اور عیصاؤ، سبا اور شبا، حصار موت اور حضار موت، اضحاک اور اسحاق، حدرموت اور حضرموت، ابی راہام اور ابراہیم، قیدار اور کیدار وغیرہ (ج۱، ص ۵۴ - ۵۱)

سید صاحبؒ نے اصول، اتحاد اسماء السنہ کو زیادہ کارآمد قرار دیا ہے، ان کا خیال ہے کہ اگر دو قوموں کے ناموں میں باہمی تشابہ نظر آئے گا تو یہ آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ دونوں قومیں حقیقت میں متحد الاصل ہیں، اسی طرح مذہبی اعتقادات کا تشابہ اور الفاظ زبان کی مماثلت اور شکلت بھی باہمی اقوام کی ایک مبہم دلیل ہے، (ج۱، ص ۵۴) ان ہی باتوں کو سامنے رکھ کر سید صاحبؒ نے عرب کے قدیم قبیلوں کے بعض متنازعہ فیہ گمنام قبیلوں کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

مستشرقین سے ٹکر | اس کتاب میں مستشرقین سے بھی جابجا ٹکر لی گئی ہے، سید صاحبؒ مستشرقین کے کارناموں کے معترف ہیں، جیسا کہ رسالہ الندوہ میں ان کی بعض تحریروں سے ظاہر ہے، (جولائی، اگست، اور دسمبر ۱۹۱۲ء) مگر ان کی تحقیقی تلبیسات اور تدلیسات سے بھی اچھی طرح واقف تھے، جن کو وہ کسی حال میں نظر انداز کر دینا پسند نہیں کرتے تھے، اس مضمون کے شروع میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ سید صاحبؒ نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ بعض مستشرقین نے تاریخ عرب قبل اسلام پر محققانہ کتابیں لکھیں، ان کے کھنڈروں کا مشاہدہ کیا، ان کے کتبے کو حل کیا، مگر ان سے عجیب وغریب نتائج استنباط کرکے قرآن کے فوائد کو پامال کیا، جن قوموں کا ذکر قرآن مجید میں ہے ان کو غیر تاریخی قرار دیا، اسی سے متاثر ہوکر سید صاحبؒ نے تاریخ ارض القرآن لکھی، ان مستشرقین میں سید صاحبؒ کے سامنے خاص طور پر ریورنڈ فارسٹر، نولدکی، مارگولیتھ اور اسپرنگر ہیں۔

ریونڈ فارسٹر سے تو وہ بہت بدظن ہیں، اس کے متعلق بہت سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اٹھارہویں صدی کے وسط میں ریونڈ فارسٹر نے عرب کا تاریخی جغرافیہ لکھا، جس میں انھوں نے اپنی جہالت کے عجیب وغریب نمونے پیش کیے، ان کو پڑھ کر کبھی ہنسی اور کبھی رونا آتا ہے، لیکن

کیا کیجیے کہ ہماری غفلت سے وہ قرآن کی صداقت کا تاریخی معیار ہے" (ج۱، ص ۵)

آگے چل کر تاریخ قدیم کے بعض اصول کے سلسلہ میں بھی لکھتے ہیں:

"مسٹر فارسٹر نے اٹھارہویں صدی کے اواسط میں عرب کا جو تاریخی جغرافیہ لکھا ہے، اس میں اس اصول سے انھوں نے نہایت کارآمد نتائج پیدا کیے ہیں، گو بعض مقامات پر ان کے استنباطات وہم وظن سے آگے کا علم نہیں بخشتے، اور کہیں علم کے بجائے وہ جہالت کا ثبوت پیش کرتے ہیں" (ج۱، ص ۵۲)

اس سلسلہ میں سید صاحبؒ نے یہ بحث کی ہے کہ زمانہ کے امتداد، قوموں کے انقلابات اور زبانوں کے تغیرات سے نام کچھ سے کچھ ہوگئے، جب ایک نام ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتا ہے تو بعض حروف کا مبادلہ خصوصیت زبان کی وجہ سے ہوجاتا ہے، سید صاحبؒ کے خیال میں ریونڈ فارسٹر کو اپنے نتائج کے استنباط میں ایسی زبانوں کا احساس نہیں رہا، سید صاحب نے اپنی کتاب میں ایسے بہت سے الفاظ کی مثالیں دی ہیں جو مبادلہ میں کچھ سے کچھ ہوگئے ہیں، (ج۱، ص ۵۳)

ریونڈ فارسٹر بطلیموس کا بہت حامی ہے جس نے اپنے جغرافیہ میں عرب کے ۵۴ قبائل، ۱۶۴ مقامات، ۵۰ کوہستانی سلسلے اور چار دریاؤں کا ذکر کیا ہے، لیکن سید صاحبؒ بطلیموس کے اس جغرافیہ کو مستند قرار نہیں دیتے، اور عرب مورخین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اکثر ان اقطاع عرب میں آبادی کا کبھی کوئی باقاعدہ مقرر اصول نہیں رہا ہے، جن کا بطلیموس نے نشان دیا ہے، اگر بطلیموس کے ناموں کی کوئی حقیقت ہے تو وہ کنویں ہوں گے یا نخلستان، جہاں کاروان اور قافلے اپنے خیمے کھڑے کر دیتے ہوں گے، (ج۱، ص ۷۰) اسی سلسلہ میں سید صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ مسعودی نے بھی مروج الذہب میں لکھا ہے کہ جغرافیہ بطلیموس کے یونانی ناموں کا سمجھنا مشکل ہے، ساتویں صدی ہجری میں یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ میں جغرافیہ بطلیموس کے اکثر بیان کردہ مقامات سے ناواقف ہوں، اور میری سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ مرور زمانہ سے وہ مٹ گئے ہیں، اور اب مجہول ہیں، دسویں صدی ہجری میں حلبی کا بھی بیان ہے کہ بطلیموس کے اکثر بیان کردہ

مقامات مٹ گئے ہیں، اور ان کے نام بدل گئے ہیں، اس لیے اس سے فائدہ اٹھانے کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ (ج۱، ص ۱-۱۰۰) لیکن ریونڈ فارسٹر نے اپنی ساری تحقیقات اور معلومات کا انحصار بطلیموس کے جغرافیہ پر کیا ہے، ظاہر ہے کہ اس کے بعد سید صاحبؒ کا یہ لکھنا کس قدر صحیح ہے کہ

"ریونڈ فارسٹر نے ۱۸۴۴ء میں عرب کے جغرافیۂ تاریخی کے دوسرے حصے میں ۱۰۹ سے ۱۷۶ تک ۱۵۷ صفحے ان ناموں کی تصدیق و تطبیق میں صرف کیے ہیں اور ہر جگہ اپنی عالمانہ جہالت کی عجیب و غریب مثال پیش کی ہے، غریب فارسٹر کو نہیں معلوم کہ یہ قبائل کب پیدا ہوئے، ان مقامات میں کب آباد ہوئے، اور عربی میں ان کا صحیح نام کیا ہے، وہ بطلیموس قبائل کے ناموں کے ہیر پھیر سے موجودہ قبائل سے تطبیق دیتا ہے، اس کو نہیں معلوم کہ اب قدیم قبائل کا اکثر و بیشتر نشان بھی نہیں، وہ عہد اسلام میں فاتحانہ کہاں سے کہاں نکل کر آباد ہو گئے، موجودہ قبائل کے نام بالکل نئے ہیں۔ (ص ۷)

پھر ریونڈ فارسٹر کے تحقیقی کارناموں کا پردہ جس طرح فاش کیا گیا ہے، وہ بھی سید صاحبؒ ہی کی زبانی سنیے، پہلے وہ لکھتے ہیں:

"بیسیوں قبائل کا نشان قدیم یونانی جغرافیوں میں ملتا ہے، جن میں تین سب سے زیادہ پرزور اور طاقتور بتائے گئے ہیں، یعنی زدمین، سیڈینی، اور بنو بری، یہ تینوں قبائل سواحل بحر احمر پر خلیج عقبہ سے عسیر تک حجاز و تہامہ میں متوطن ظاہر کیے گئے ہیں، لیکن ان کے اصلی اور صحیح نام کیا ہیں؟ ان ناموں کا تو عرب میں کوئی قبیلہ نہیں" (ج۱، ص ۸۰)

(باقی)

اصول علم تمدن اور سیرت طیبہ

از

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی، دہلی

تمدن بداوت کی ضد ہے، دیہات و صحرا کی زندگی میں سادگی ہے، فطرت سے قرب ہے، مگر نظم معاشرت نہیں ہے، مدنیت کی زندگی میں ایک دوسرے پر انحصار زیادہ ہے، اس لیے پیچیدگی بھی زیادہ ہے، اسی لین دین سے معاشرہ کا وجود ہے، اور اسی لیے انسان کو "سماجی جانور" کہا گیا ہے، تمدن کی بنیاد تہذیب اخلاق اور انس والفت ہے، اس میں آداب و عادات، علم و فن، آبادکاری، فن تعمیر، مشاغل تفریح، صنعت و حرفت، نظام زراعت کے علاوہ ملکی و مالی انتظام کے متعلق مباحث و مسائل بھی آجاتے ہیں اس طرح مطالعۂ تمدن کے سیاسی، انتظامی، علمی، اخلاقی اور جمالیاتی متعدد پہلو ہیں، انسان نے جب سے مل جل کر رہنا سیکھا ہے، سطح ارض پر مختلف تہذیبیں وجود میں آچکی ہیں، بابل و نینوا، مصر و سندھ کی تہذیبوں سے علم تمدن کا ہر طالب علم واقف ہے، لیکن آج ان تہذیبوں کو ان کے آثار و عمارات، صنعت و حرفت، رقص و موسیقی، رسوم و توہمات اور اساطیر و خرافات کے مظاہر میں تلاش کیا جاتا ہے، جو تہذیبیں فنا ہو گئیں ان کے تصور اقدار کے بارے میں ہماری معلومات بہت ناقص اور محدود ہیں، ان ہی تہذیبوں نے ایسے مذاہب کو جنم دیا جن میں غالب حصہ اوہام و اباطیل کا ہے، اور یہ تاریخ کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ ان تہذیبوں کا جو قوی حصہ تھا وہ فنا ہو گیا، لیکن اوہام و خرافات ہمیں وراثت میں مل گئے،

اسلام کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ امن و آشتی کا مذہب ہے، اللہ کی زمین کو فساد سے پاک کرنا اور اسے خیر و صلاح سے آراستہ کرنا اسلام کا مقصد وجود ہے، اس لیے **امر بالمعروف اور نہی عن المنکر** ہر مسلمان کی ذمہ داری ہو جاتی ہے، اسلام ایسی اصلاح پر بھی نفریں کرتا ہے جو بظاہر خیر نظر آئے، لیکن اس کے عواقب میں شر و فساد پوشیدہ ہو، اسلام ان مذاہب میں سے نہیں ہے جو تہذیب کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں، اگرچہ اسے سامی تہذیب سے جوڑا جاتا ہے، اسلام کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے، اب یہ توفیق کی بات ہے کہ انسان لاکھوں بے سر و پا اوہام کو یقین سے بھی زیادہ ماننے اور وحی کے وجود و قوت سے انکار کر دے۔

اسلام سارے بنی نوع انسان کے لیے ہے اور اسے کرۂ ارضی کے گوشہ گوشہ تک جانا تھا، اس لیے اسے عالمی تہذیب و تمدن کا دیباچہ بنا کر بھیجا گیا، ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اسلام کے اصولی عقائد میں اصول تمدن کی کیا رعایتیں رکھی گئی ہیں، اور سیرت طیبہ و حدیث نبوی میں تمدن کا کیا تصور پیش کیا گیا ہے، اسلام کے ایوانِ رفیع میں بنیادی اور کھر بجنے کی اینٹ عقیدۂ "توحید" ہے، یہ ساری بشریت پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا احسان عظیم ہے کہ آپ نے توحید باری کا بالکل واضح، غیر مبہم اور روشن تصور پیش کیا، اور اسے اتنی بدیہی حقیقت بنا دیا کہ اب اس سے کامل انحراف کسی سے بھی بن نہیں پڑتا، بقول اکبر الٰہ آبادی ؎

تثلیث کے قائل نے بھی خالق کو کہا ایک
تھی تین پہ سوئی مری ہیبت سے بجا ایک

قرآن کریم نے توحید ہی پر ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی استوار کی ہے، اس سے جڑا ہوا عقیدہ رسالت پر ایمان لانا ہے، اور یہ دو مقصد حاصل ہوں تو آخرت پر ایمان خود ہی نصیب ہو جاتا ہے، بعث بعد الموت حشر و نشر، وزن اعمال، جنت و جہنم، وجود ملائکہ وغیرہ پر ایمان بالغیب، تصور آخرت کے لیے ضروری ہے، اور توحید کے بعد عقیدۂ آخرت وہ دوسری بڑی نعمت ہے، جو ہمیں اسلام سے ملتی ہے، آخرت کا عقیدہ ہماری مسئولیت (ACCOUNTABILITY) کو قائم کرتا ہے، آج مادہ پرست اور بے دین معاشروں میں انسان شتر بے مہار بن کر رہ رہا ہے، یہی وہ بہیمیت، جاہلیت اور انارکی ہے جسے اسلام دور کرنا چاہتا ہے،

اسلامی معاشرہ میں ہر فرد یہاں بھی قانون شریعت کے سامنے مسئول ہے، اور آخرت میں بھی اپنے ذرہ ذرہ اعمال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا، آخرت پر عقیدہ راسخ ہونے پر ہی مرتبۂ ایمان حاصل ہو سکتا ہے، کیونکہ ایمان در اصل تصدیق بالقلب (دل سے ماننا) اور عمل بالجوارح (اعضاء سے عملی اثبات) کا نام ہے، اور ایمان ہی وہ قوت ہے جو معاشرہ کی تمام برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ سکتی ہے، اہل ایمان کا معاشرہ ایک ایسی تہذیب کو جنم دیتا ہے جس میں مفادات کی بنیاد جبر و استحصال پر نہیں ہوتی۔

اسلامی فکر کی روشنی میں جس تمدن کا خاکہ تیار ہوتا ہے اس میں فرد کو اولیت حاصل ہے، اس لیے کہ معاشرہ بھی اصلاً مجموعۂ افراد ہی ہے، اسلام نے حقوق انسانی کا تعین درجہ بدرجہ کیا ہے، پہلے اپنے نفس کا حق ہے، پھر ذوی القربیٰ 'الاقرب فالاقرب' کے اصول پر، یعنی جتنا قریب کا رشتہ ہے، اتنا ہی حق زیادہ ہے' ظاہر ہے کہ والدین، اولاد، ازدواج، بہن بھائی، بنی اعمام اور ذوی الارحام ہر ایک کے حقوق کا درجہ متعین کر دیا گیا ہے، اور اس کی حکمت (CRITERIA) سماجی انصاف کا حصول ہے، پھر بہترین معاشرتی تعلقات کے لیے پڑوسیوں کے حقوق جتائے گئے، اور حدیث شریف میں حق ہمسایگی کی بار بار اتنی تاکید آئی ہے کہ اصحاب رسول ﷺ یہ سوچنے لگے تھے کہ شاید آپ وراثت میں بھی پڑوسی کا حصہ مقرر فرمانا چاہتے ہیں، ہمسایہ کے لیے وہی چاہے جو خود اپنے لیے چاہتا ہو (مسلم) اور اپنے مکان کو پڑوسی کے گھر سے اونچا نہ بنائے، تاکہ اس کی ہوا نہ رکے، اور اپنے چولھے کے دھوئیں سے پڑوسی کو ایذا نہ دے۔" (طبرانی)

پھر یتامیٰ اور مساکین کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل میں جو تاکید ہے اس سے زیادہ سماجی انصاف اور معاشرتی تحفظ و تامین (SOCIAL SECURITY) اور پسماندہ طبقات کی خیر خواہی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، آج کا سماج وارا اقتصادی اعتبار سے پسماندہ لوگوں کے لیے بہت کچھ دعوے کر رہا ہے، یہ علمی تحقیق اور فلسفیانہ موشگافیوں کا موضوع بھی ہے، اس پر سیمینار اور سمپوزیم ہو رہے ہیں، قرار دادیں منظور ہی ہیں، ریزولیوشن پاس ہو رہے ہیں، مگر ریزولیوشن کی شورش ہے مگر اس کا اثر غائب ہے

پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا

دوسری طرف سوشل ورک کے ادارہ میں "یونین" ہے، تحفظ کے لیے قانون سازی ہے، بے سہارا انسانوں کے لیے پناہ گاہیں (SHELTERS) بنی ہیں، ملازمتوں میں ان کے لیے رزرویشن بھی رکھا جا رہا ہے، اور بھی بہت کچھ ہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دنیا میں کمزوروں اور مسکینوں کے کسی حمایتی نے یہ دعا نہیں مانگی کہ۔

اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّ اَمِتْنِیْ	اے اللہ مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھیو، مسکین
مِسْکِیْنًا وَّ احْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ	بنا کر ہی موت دیجیو اور میرا حشر بھی مساکین
الْمَسَاکِیْنِ۔	کی ٹولی میں کیجیو۔

اب دنیا میں مساکین کے لیے جو کچھ بھی کہا جائے گا یا کیا جائے گا وہ اس دعائے نبوی کے سامنے فروتر ہی رہے گا۔

ایک اسلامی معاشرہ خواہ اس میں شریعت پر مبنی حکومت نہ ہو، ہر فرد کو ضمانت دیتا ہے، حتی کہ ایک مسافر بھی سارے معاشرہ کا مہمان ہوتا ہے کیونکہ "ابن السبیل" کو بھی اہل حقوق کے زمرہ میں شامل کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ ابن السبیل کے لیے مسلم و غیر مسلم کی شرط بھی نہیں ہے۔

اسلامی تمدن میں اقتصادی توازن باقی رکھنے کے لیے عام حکم انفاق اموال (گردش زر) کا ہے:
لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ، اس سے دولت کی ذخیرہ اندوزی نہیں ہوتی، اور اس کے مفاسد کا تدارک بھی ہوتا ہے، آج کا ترقی یافتہ علم الاقتصاد بھی دقیق ریسرچوں کے بعد اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکا کہ معاشرہ کی اقتصادی خوش حالی کی ضمانت دولت کی گردش میں ہے، اسلام نے دولت اور اجناس دونوں کی ذخیرہ اندوزی پر لعنت بھیجی ہے، (ابن ماجہ و مشکوٰۃ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دولتمند لوگ جنت میں رینگتے ہوئے جائیں گے، اپنی مسئولیت کی وجہ سے۔ عام انفاق کے بعد صدقہ ہے جس پر

ہزاروں نیکیوں کی بنیاد قائم کر دی گئی اور اسے بلاؤں کا رد کرنے والا بتایا گیا، یہ سب رضاکارانہ مصرف ہیں، لیکن صاحب استطاعت لوگوں پر کم از کم ڈھائی فیصد زکوٰۃ کی حیثیت شرعی اجباری ٹیکس کی ہے، جو ارکان دین میں دوسرے نمبر پر ہے، اس کی مقدار مقرر ہے، اور اسے محتاجوں کا "حق" بتایا گیا ہے، کسی دوسرے مذہبی نظام میں زکوٰۃ جیسا انقلابی اقتصادی نظریہ موجود نہیں ہے، افسوس ہے کہ ہم تحصیل و تقسیم زکوٰۃ کا مرکزی نظام کھو بیٹھے جو یتیموں، بیواؤں، مسکینوں اور ناداروں کا سب سے بڑا سہارا تھا، یہ نظام زندہ ہوتا تو کسی بے سہارا مطلقہ کو قانون فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ کا سہارا لینے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

کسی تمدن کی خوبی یہ ہے کہ وہ قومی عظمت و وحدت کی تعمیر کرے اور ایک خوشحال سوسائٹی بنائے جس میں معاشرتی تعلقات کی بنیاد انصاف پر ہو، لوٹ کھسوٹ پر نہ ہو، اسلام نے سود کا دروازہ بند کر کے اقتصادی سطح پر استحصال کا خاتمہ کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سود کا گناہ ستر حصے ہے اور اس کا ادنیٰ حصہ یہ ہے کہ جیسے کوئی اپنی ماں سے زنا کرے (ابن ماجہ و مشکوٰۃ) اور فرمایا کہ کسی کو قرض دو تو پھر مقروض سے کوئی ہدیہ قبول نہ کرو کیونکہ اس میں بھی شائبہ سود کا ہے، (بخاری) اسی طرح رشوت لینے والا، دینے والا، اور اس کا معاملہ طے کرانے والا سب ملعون ہیں (ابو داؤد، مسند) جو نفع کمایا جائے اس کا یقینی ہونا ضروری ہے، اسی لیے جوا اور اس سے ملتی جلتی سب چیزیں حرام مطلق ٹھہریں، حد یہ کہ درخت پر لگا ہوا پھل بیچنا بھی ناجائز ہوا، کیونکہ اس کے صحیح وزن اور نوعیت کا یقین حاصل نہیں ہوتا، احتمال باقی رہتا ہے۔

اب مغربی تہذیب کے مظاہر پر نظر ڈالیے تو مختلف نشہ آور اشیاء جیسے شراب، مارفیا، ہیروئن، ایل۔ایس۔ڈی وغیرہ کا آزادانہ استعمال جس کے لیے کھربوں روپیہ کا ناجائز کاروبار ساری دنیا میں اور خاص طور سے عالم ثالث میں ہو رہا ہے، پھر ایک ایسی آزاد (PERMISSIVE) سوسائٹی جیسی مانویت کے پیروکاروں نے بنائی تھی، بلکہ اس سے بھی بدتر جنس (SEX) کا رشتہ اخلاق اور مذہب دونوں سے منقطع کر دیا گیا ہے، انجام یہ کہ اس زرق برق معاشرہ میں زنا کا تصور ہی ختم ہو چکا ہے، انگستان

جیسے ملک میں ہم جنس پرستوں کے کلب موجود ہیں اور لواطت کو قانونی تائید حاصل ہے، اس سے نسلی خصوصیات کا خاتمہ ہو چکا ہے، اور بہت بڑی تعداد میں ایک ایسی درمیانی نسل وجود میں آچکی ہے جو قدامت و جدت کے درمیان آویزاں ہے، اور الحاد و زندقہ اسی کے دم سے پھل پھول رہا ہے۔

اسلامی تمدن میں جنسی زندگی آزاد بھی ہے اور پابگل بھی، تعدد ازدواج کی رخصت میں یہ حکمت بھی تھی کہ وسیع تر خاندانی تعلقات قائم ہوں، عورتوں کے حقوق و فرایض کی صراحت کی گئی ہے، اور انھیں سوسائٹی میں باعزت مقام دیا گیا ہے (ترمذی) معاشرتی تعلقات میں کسب حلال کی تلقین ہے، حدیث شریف میں کد یمین سے کمانے والے (دستکار یا مزدور) کو حبیب اللہ کہا گیا ہے (ترمذی) مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کی جائے (ابن ماجہ) تجارت میں حسن معاملہ کی سخت تاکید ہے، اور کم ناپ تول کرنے یا دھوکا دھڑی سے بیچنے والے کے لیے سخت وعید آئی ہے (ابن ماجہ و ترمذی) ایماندار تاجر کا حشر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا، (ترمذی)

اسلامی معاشرہ میں حاکم و محکوم کا تعلق جمہوری انتخاب سے قائم ہوتا ہے، آج الکشن ووٹ کے ذریعہ ہوتا ہے، مگر اس میں فریقین کے لیے کوئی شیرازہ (BINDING FACTOR) نہیں ہے، بیعت اطاعت کا اسلامی (INSTITUTION) زیادہ محکم اور فریقین میں ربط باقی رکھنے والا ہے، لیکن بیعت بھی تابع شریعت ہے: لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق (بخاری، مسلم، مشکوٰۃ) انتظام ریاست کا ضابطہ عدل و انصاف سے بنتا ہے، نظام عدالت کے لیے شہادت کی جو بنیاد فقہ اسلامی نے قائم کر دی ہے وہ (LAW OF EVIDENCE) آج بھی ایک آفاقی اصول مانا جا رہا ہے، اور ایسے کسی انصاف کا تصور نہیں کیا جا سکتا جسے قانون شہادت سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہو، دستور مدینہ کی دفعہ ۲۶ میں سیکولرزم کی بنیاد بھی موجود ہے جس میں غیر مسلموں سے بھی منصفانہ سلوک کی تاکید ہے، فرقہ وارانہ فسادات نام کی یا اس سے ملتی جلتی کوئی شیطنت کبھی کسی اسلامی معاشرہ میں نہیں پائی گئی۔

احادیث نبویؐ میں ایمان لانے والوں کو ایک بامقصد اور مسئول زندگی گذارنے کی دعوت دی گئی ہے، کسی جدید طرز زندگی میں مقصد حیات اتنا واضح نہیں ہے اسی لیے لہو ولعب کے مشاغل سے مسلمان کو باز رکھا گیا ہے، حدیث شریف ہے: مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَا لَا یَعْنِیْهِ (ترمذی، ابن ماجہ) یعنی حسن اسلام یہ ہے کہ وقت ضایع کرنے والی فضول باتوں کو چھوڑ دیا جائے، اس لیے اسلامی تمدن کو رقص و سرود، مصوری یا مجسمہ سازی جیسے مشاغل میں تلاش نہیں کیا جا سکتا، اوہام و اباطیل اور فضول رسموں کا دروازہ بدعات سے بچنے کی تاکید نے بند کر رکھا ہے، (بخاری و مسلم) اصول معاشرہ اور اصول تمدن کے تحفظ (CONSERVATION) کا اس کو بھی ایک موثر وسیلہ سمجھنا چاہیے۔

کوئی لباس "اسلامی" نہیں ہے، لیکن اصولی طور پر غیر اسلامی لباس سے تشابہ ممنوع ہے (ابوداؤد مسند) مرد کے لباس میں تفاخر نہ ہو، بس صاف ستھرا اور بے تکلف ہو، عورتوں کے لباس میں زینت کی نمایش اور تجاذب نہ ہو، (مشکوٰۃ، ابوداؤد) اسی طرح کھانے میں یہ شرط ہے کہ وہ پاک ہو، حلال کمائی کا ہو اور شکم پروری کے لیے نہ ہو۔

افراد معاشرہ سے قوانین شریعت کا مطالبہ طہارت، حلم، عفو، صبر و استقامت، تسلیم و رضا، ایفائے عہد، شجاعت و سخاوت، قناعت و توکل، دیانت و امانت، ایثار اور صلہ رحمی کا ہے، ان سب اوصاف کا حاصل ہے "عبدیت" جو ارکان دین کی بجا آوری سے حاصل ہوتی ہے، اور اس کا مفہوم ہے خالق سے اپنا رشتہ استوار کرنا، یہ ہو جائے تو انسان انسان کے رشتوں میں خود ہی بہتری آجاتی ہے۔

احادیث نبویؐ کی روشنی میں جو طرز زندگی ابھر کر سامنے آتا ہے وہ فرد کو معاشرہ کا ایک فعال اور ذمہ دار رکن بناتا ہے، اسے اپنی تکمیل اور معاشرہ کے اکمال کی دعوت دیتا ہے، اس کا ہر قدم نئی جستجو کے لیے اور ہر سانس ذوق طلب سے سرشار ہوتا ہے، مَنِ اسْتَوٰی یَوْمَاهُ فَهُوَ مَغْبُوْنٌ (جس کے دو دن برابر رہے وہ گھاٹے میں رہا) مومن کا ہر دن ترقی احوال کی طرف نیا قدم ہوتا ہے۔

جدید علم تمدن میں حاکم و محکوم کے تعلقات اور عام نظم و نسق کے اصول و ضوابط تو بہت کچھ ہیں، لیکن اخلاق کو اس سے بے دخل کر دیا گیا ہے، گویا وہ ایک علیحدہ ہی (DISCIPLINE) ہے جس کا رشتہ نہ مذہب سے ہے، نہ تمدن سے، نہ جنسی زندگی سے، وہ ایک ایسا زائد مضمون ہے جس میں آپ کتنے ہی نمبر حاصل کر لیں، وہ (AGGREGATE) میں شامل نہیں ہوتے، لیکن اسلامی تمدن میں اخلاق کی یہ حیثیت نہیں، یہاں وہ ایسا محور ہے جو تمام دوسرے تصورات اقدار کو چلا رہا ہے،

قدیم تہذیبیں ایک سادہ و بسیط زندگی کو نسبتہً نظم و ضبط اور باہمی انحصار کے ساتھ گذارنے کا نمونہ تھیں، لیکن جب وہ فنا ہو گئیں تو اپنے پیچھے کچھ بھی نہیں چھوڑا، سیرت و احادیث نبوی میں اصول تمدن کی ابدی بنیادیں ملتی ہیں، معاشرے بدلتے رہیں گے مگر اصول اپنی جگہ قائم رہیں گے، اس لیے کہ وہ اصول خدا ساز ہیں، اور ان کا مصدر وحی الٰہی ہے، ورنہ ریگستان حجاز میں جنم والی تہذیب اس وقت کی متمدن ساسانی، رومی، اور بیز نطینی قوتوں کو بھلا کیسے نیچا دکھا سکتی تھی، اور ایک نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک آفاقی نظام حیات کیسے پیش کر سکتے تھے، ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست   کتب خانۂ چند ملت بشست

(ایک یتیم بچہ جس نے لکھنا پڑھنا بھی نہیں سیکھا تھا، اس نے چند ملتوں کے پورے پورے کتب خانے دھو کر رکھ دیے،)

اس وقت اطراف عالم میں جو تمدن رائج تھے، ان میں ایرانیوں کو اپنے رنگ کا گھمنڈ تھا تو آریوں نے اپنی معاشرت کو پیشوں کے اعتبار سے جاتیوں میں بانٹ رکھا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی معاشرہ کی ہر قسم تقسیم و تفریق کی نفی کر کے ایک ایسے تمدن کا تصور دیا، جس میں عظمت آدمؑ اور "احترام آدمیت" سب سے زیادہ نمایاں وصف ہے، اور انسانوں میں تفوق و فضیلت کی بنیاد "تقویٰ" یعنی اعمال صالحہ ہیں، تمدن اور حضارت کے فروغ و بقا کا راز یہی تقویٰ اور خشیت الٰہی ہے، کیونکہ اس سے انسانوں کے

درمیان خیر خواہی کے تعلقات قائم ہوتے ہیں، اور افراد کی اخروی مسئولیت انھیں تخریب و استحصال سے باز رکھتی ہے، آج کی متمدن دنیا کا المیہ یہی ہے کہ سب کچھ ظاہری نمود و نمائش، طمطراق اور مادی وسائل کے ہوتے ہوئے بھی سینوں میں بھٹی سلگ رہی ہے اور بے نام خطرے سروں پر منڈلا رہے ہیں، شقاوت اور سنگدلی اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ چکی ہے، صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ممالک اپنا اسلحہ فروخت کرنے کی غرض سے تیسری دنیا کے ننگے بھوکے عوام کو ہمیشہ برسر جنگ رکھنا چاہتے ہیں، پہلی دو عالمی جنگوں کے پیچھے بھی یہی سیاسی اور اقتصادی خود غرضی کارفرما تھی، اور آیندہ بھی جب کبھی تجارتی و صنعتی مفادات کا توازن بگڑے گا تو یہ نام نہاد متمدن ممالک دنیا کے کروڑوں انسانوں کو جنگ کی بھٹی میں بے تکلف جھونک دیں گے، یہ آخر کیسا تمدن اور کیسی صنعتی تہذیب ہے، جو اپنی اس سنگدلی اور حیوانیت پر ذرا نہیں شرماتی، جس کا بچہ بچہ "پہاڑی وعظ" سنتا ہے، مگر اسے عالم انسانیت پر رحم کرنے کے لیے کسی شے کی دہائی نہیں دی جا سکتی۔

غرض آج نہیں تو کل دنیا یہ تسلیم کرے گی کہ انسانی تہذیب کی بقا اور فروغ کا راز بھی سیرۃ طیبہ اور احادیث میں موجود ہے، اور ہمارے ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدنیت کے ایسے ابدی اور آفاقی اصول بیان فرما دیے ہیں جو کاروان تمدن کی راہوں کو سدا اجالتے رہیں گے اور انسانیت کی بقا کی ضمانت دے سکیں گے۔

فان فضل رسول اللہ لیس لہ   حد فیعرب عنہ ناطق بفم

یا رب صل وسلم دائما ابدا   علی حبیبک خیر الخلق کلھم

وراقت: کتاب منزل بمنزل

از

مولانا محمد عبدالحلیم چشتی، کانو، نائجیریا،

عہد عباسی میں علوم و فنون کی تدوین اور کتابی صورت میں ان کی اشاعت ایسی تیزی سے کی گئی تھی کہ نقل و اشاعت کے لیے ایک نئی صنعت اور نیا علم وراقت وجود میں آیا تھا، صنعت وراقت، کاغذ سازی، جلد سازی، سامان کتابت (تصحیح و ضبط اعراب) سے عبارت تھی[1]، جیسا کہ سابق میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، صنعت وراقت کا تعلق انسان کے علوم و افکار سے ہے اور اسی کے ساتھ مخصوص ہے[2]، علوم و معارف اور اعلیٰ صنعتیں جو انسان کی فکری کاوشوں کے نتائج ہیں کمال تمدن کی ضامن اور آرائش و زینت کا موجب ہیں[3]۔

کتابت، طباعت اور موسیقی وہ صنعت ہیں جو بادشاہوں (وزیروں اور امیروں) سے ربط و ضبط اور رسائی کا ذریعہ رہی ہیں، اس لیے ان صنعتوں کو دوسری صنعتوں کے مقابلہ میں اہمیت اور برتری حاصل ہے[4]، عہد عباسی اور اس کے بعد مسلم حکمرانوں کے دور عروج میں وراقت و کتابت کی صنعت کو بہت فروغ حاصل تھا، مورخ ابن خلدون کہتا ہے:

[1] ابن خلدون، المقدمہ ص ۵۵، ۱، القلقشندی، صبح الاعشیٰ ج ۲، ص ۴۸۰، ۴۸۲، السمعانی، کتاب الانساب ورق ۵۷۹،

[2] ابن خلدون، ص ۱۳، ۱۵، [3] ایضاً ص ۲۲، ۲۳، [4] ایضاً۔

"صنعت وراقت ملت اسلامیہ میں عراق سے اندلس تک ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح تھی، متمدن آبادی اور اطراف مملکت میں اس کی گرم بازاری تھی، کثرت سے علمی کتابیں لکھی جاتی اور اسلامی دنیا کے ہر گوشہ میں ان کی نقلیں لی جاتی، جلدیں بندھوائی جاتی تھیں، کاتب، وراق، نقل، تصحیح، جلد سازی اور دوسرے کاموں میں بہت مشقت اٹھاتے تھے، یہ صنعت بڑے بڑے آباد شہروں میں خصوصیت سے بہت ترقی پر تھی[1]"

اس صنعت کے مرکز توجہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ بنی نوع انسان کے علم و دانش میں اضافہ اور معیشت کو مستحکم کرنے کا موثر ذریعہ رہی ہے، ابن خلدون کہتا ہے:

"صنعت کتابت چونکہ متعدد علوم پر مشتمل ہے، اس لیے یہ دوسری صنعتوں کے مقابلہ میں زیادہ عقل سکھاتی ہے، کتابت میں خطی حروف سے الفاظ کی طرف اور الفاظ سے معانی کی طرف، پھر ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف ذہن کی رسائی ہوتی ہے، اس سے نفس انسانی میں دلائل سے مدلولات کی طرف منتقل ہونے کا ملکہ پیدا ہوتا ہے، یہ ملکہ نظر عقلی سے عبارت ہے، نامعلوم علوم کو حاصل کرنے اور انھیں بار بار سمجھنے سے عقل و دانش میں اضافہ ہوتا اور معاملہ فہمی میں بصیرت پیدا ہوتی ہے[2]"

عہد عباسی میں صنعت وراقت نظری و عملی ہر دو پہلوؤں سے اہل علم کی مرکز توجہ بنی ہوتی تھی، چنانچہ مشہور فلسفی ابوزید، احمد بن سہل بلخی (۲۳۵ - ۳۲۲ھ = ۸۴۹ - ۹۳۴ء) نے فضل صناعۃ الکتابۃ و وراقت کی فضیلت میں ایک رسالہ لکھا تھا[3] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بلخ اور دوسرے اسلامی شہروں میں صنعت وراقت ایک معزز پیشہ سمجھی جاتی تھی، نیز ابوحیان توحیدی المتوفی سنہ ۴۱۴ھ نے وراقت کے موضوع پر ایک رسالہ ترتیب دیا تھا جس میں کتابوں کے نقل کرنے کے اصول اور وراقوں کی تصحیف سے بچنے کے قواعد بیان

[1] ابن خلدون ص ۵، [2] ایضاً ۴۲۷، اویس وفا ابن محمد الارزنجانی، منہاج الیقین شرح ادب الدنیا والدین، آستانہ محمود بک مطبعہ سنہ ۱۳۲۸ھ، ص ۳۷۰، [3] معجم الادباء ط ۲ القاہرۃ، مطبعۃ ہندیہ ج ۱، ص ۱۴۳،

کیے تھے۔[۱]

سوق الوراقین | ان وجوہ سے عہد عباسی میں صنعت وراقت اور دوسرے اہم مسائل جن کا تعلق اس صنعت اور سوق الوراقین سے ہے اسلامی قلمرو میں ان سے خصوصی اعتنا کیا جاتا تھا، سوق الکتب میں جانے کی ترغیب دی جاتی تھی، مہلب المتوفی ۸۳ھ اپنے فرزندوں سے کہتا تھا تم بازاروں میں صرف سوق حرب (جہاں سامان حرب وضرب بکتا ہے) اور سوق الوراقین میں بیٹھا کرو۔[۲] اور عربی شاعر کہتا ہے:

مجالسة السوق مذمومة ومنها مجالس قد تخشب

(بازاروں میں اٹھنا بیٹھنا اچھا کام نہیں ہے لیکن بازاروں کی بعض بیٹھکیں لائق عزت ہیں)

فلما تقربن غیر سوق الجیاد وسوق السلاح وسوق الکتب

(لہٰذا تم گھوڑوں، ہتھیاروں اور کتابوں کے بازار کے علاوہ کسی بازار میں نہ پھٹکنا)

فهاتيك الة اهل الوغى وهاتيك ألة اهل الادب

(کیونکہ گھوڑوں اور ہتھیاروں کا بازار مردانِ کارزار کے سامان کا بازار ہے، اور کتابوں کا بازار اہل ادب کے سامان کا بازار ہے)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دنیا میں سب سے زیادہ آباد اور پر رونق گھوڑوں، ہتھیاروں اور کتابوں کے بازار تھے، نیز عربوں کو اپنے تہذیبی وثقافتی مرکز وسرمایہ سے کیسی دلچسپی ورغبت تھی، اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی معاشرے میں سیف وقلم کے بازار ہی عزت وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، اور ان ہی کی طرف لوگوں کو جانے کی ترغیب دی جاتی تھی، یہ ترغیب کتب اور کتب خانوں کی نشر واشاعت، تشہیر اور علمی افادہ واستفادہ کا باعث تھی۔[۳]

---

[۱] معجم الادباء طبع القاہرۃ، مطبعۃ ہندیہ ج ۵، ص ۱۳ [۲] کتاب العقد الفرید لابن عبدربہ القاہرۃ، مطبعۃ لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر ۱۳۵۹ھ ج ۲ ص ۲۱۰ [۳] الخطط المقریزیۃ، القاہرۃ، دار الطباعۃ المصریہ بولاق ۱۲۷۰ھ ج ۲، ص ۱۰۲

سوق الوراقین کی کثرت | عہد عباسی میں اسلامی قلمرو کے ہر شہر میں سوق الوراقین پایا جاتا تھا، لیکن مرکزی شہروں کے سوق الکتب کو شہرت حاصل ہوتی تھی، ان میں مندرجۂ ذیل شہروں کے سوق الکتب کو تاریخ میں زیادہ شہرت حاصل رہی ہے، کوفہ،[۱] بصرہ،[۲] بغداد،[۳] واسط،[۴] دمشق،[۵] قاہرہ (قاہرہ کے محلہ فسطاط میں جامع عمرو بن العاص کے مشرقی گوشہ کی طرف بہت بڑا سوق الوراقین تھا[۶])، بخارا،[۷] مصر۔

سوق الوراقین کی علمی وثقافتی حیثیت | یہ سوق الکتب مقامی ارباب کمال کی نظر میں ہوتے تھے، چنانچہ ابوبکر احمد بن یحییٰ المتوفی ۳۰۱ھ جن کی حفظ حدیث میں شہرت تھی، جب کوفہ میں وارد ہوئے اور ابن عقدہ سے جنھیں اپنے حفظ پر ناز تھا، ملاقات ہوئی تو باتوں ہی باتوں میں ابن عقدہ نے ان سے کہا، حدیث کی زیادہ باتیں نہ کیجیے، کسی وراق کی دکان پر چلیے، تبان (پیمانۂ غلہ) بھیجیے اور کتابیں جتنی چاہیں تلوائیے، پھر ہم بحث کریں گے، تو ان کے ہوش اڑ گئے تھے۔[۹]

اس سے معلوم ہوا کہ اس دور میں سب سے بڑا عالم وہ سمجھا جاتا تھا جس کی نظر میں اپنے فن سے متعلق سوق الوراقین کی جملہ کتابیں ہوتی تھیں، سوق الکتب میں بعض اہل علم وراق کی علمی شہرت ایسی تھی کہ ان کے

---

[۱] تاریخ بغداد ج ۵، ص ۱۶، الانساب للسمعانی، ورق ۳۹۴ [۲] تاریخ بغداد ج ۳ ص ۱۷۲، انباہ الرواۃ علی انباہ النحاۃ للقفطی، القاہرۃ، دار الکتب المصریہ ۱۳۶۹ھ ج ۲، ص ۱۷۳ [۳] البلدان للیعقوبی ط: ۲، النجف المطبعۃ الحیدریہ، ۱۳۷۷ھ ص ۱۳، مناقب بغداد لابن الجوزی، ص ۲۶ [۴] الجواہر المضیئہ للقرشی ج ۲، ص ۱۵۵، مصطفیٰ جواد، معجم مواضع واسط، مجلۃ المجمع العلمی العراقی، المجلد الثامن (۱۹۶۱ء) ص ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۷۱، [۵] وفیات الاعیان لابن خلکان ج ۲ ص ۲۱۰، احسن التقاسیم للمقدسی ص ۱۵۰، مدینہ دمشق عند الجغرافیین والرحالین المسلمین للمنجد، بیروت، دار الکتاب العربی ۱۹۶۷ء، ص ۷، [۶] الخطط المقریزیہ ج ۲، ص ۱۰۲ [۷] عبد الرحمن زکی، نہضۃ العلوم فی قاہرۃ الفاطمیین، المجلۃ مجلۃ الثقافۃ الرفیعۃ، القاہرۃ، شمارہ ۱۴۸، اپریل ۱۹۶۹ء ص ۱۷ [۸] تتمہ صوان الحکمۃ للبیہقی ص ۴۲، [۹] تاریخ بغداد للخطیب ج ۵ ص ۱۶، السمعانی ورق ۳۹۴، ابن الجوزی ج ۶، ص ۲۲۷۔

تجارتی اوقات میں بھی دوکان پر آکر لوگ ان سے کتابوں کی سند لیتے تھے،[1] شعراء کا کلام نقل کیا جاتا تھا،[2] بعض دوکانوں میں علمی مباحثے ہوتے تھے،[3] اہل علم، وراق کے ذریعہ معلومات فراہم کرتے تھے، چنانچہ ابوالعلاء المعری کا بیان ہے: میں مدینۃ السلام بغداد میں تھا، وہاں ایک وراق کو دیکھا کہ وہ عدی بن زید کے اشعار جن کا مطلع تھا: بکر العاذلات فی غلس الصب

ح یعاتبنہ اما تستفیق

ودعا بالصبوح فجراً فجاءت

قینۃ فی یمینہا ابریق

کے قافیہ کے متعلق پوچھتا تھا، وراق کا زعم تھا کہ ابن حاجب النعمان نے اس قصیدہ کے متعلق دریافت کیا تھا، دیوان عدی کے نسخے بھی طلب کیے تھے، لیکن وہ نہیں ملے، پھر میں نے استراباذی کو سنا کہ وہ یہ قافیہ دیوان العبادی میں پڑھتا تھا، لیکن دار العلم بغداد کے نسخہ دیوان العبادی میں یہ قافیہ موجود نہیں تھا،[5] علماء وادباء کی مجلسیں جمتی تھیں، ناقدان فن کے جوہر کھلتے تھے، چنانچہ ابونصر زجاج کا بیان ہے کہ میں سوق الوراقین میں ابوالفرج صاحب الاغانی کے ساتھ ایک دکان پر بیٹھا ہوا تھا اور قریب ہی وراق ابوالفتح بن الجزاری کی دکان پر ابوالحسن علی بقال شاعر سے ابراہیم صولی کے شعر سنا رہا تھا، جب وہ مندرجہ ذیل شعر پر پہونچا:

رأی خلتی من حیث یخفی مکانہا

وکانت قذیً عینیہ حتی تجلت

(اس نے میری حاجت کو پوشیدہ جگہ دیکھا، وہ اس کی آنکھ میں تنکا تھی کہ فوراً نکل گئی)

تو اس نے اس کی بہت داد دی، ابوالفرج اس منظر کو دیکھ رہا تھا، اس نے مجھ سے کہا جاؤ، اس سے پوچھ کہ اس شعر میں خوبی کیا ہے؟ میں نے جاکر پوچھا تو اس نے کہا: شاعر کا قول 'وکانت قذی عینیہ' ہے، ابوالفرج نے کہا جاؤ، کہو کہ شعر کی خوبی کے ادراک میں تم سے غلطی ہوئی ہے، اصل خوبی من حیث یخفی مکانہا میں مضمر ہے، اس طرح بحث چھڑ جاتی تھی،[6] ابوحیان توحیدی (۔۔۔ ۔۔۔ ۴۰۰ھ ....

[1] تاریخ بغداد ج ۳ ص ۷۰، [2] انباہ الرواۃ للقفطی ج ۲، ص ۳۰۰-۳۰۱ [3] الوافی بالوفیات للصفدی ج ۲ ص ۱۱۹ [4] ابن خلکان ج ۲، ص ۲۱۰ [5] رسالۃ الغفران للمعری ط: ۵ القاہرۃ، دار المعارف، ص ۱۳۶، ۱۴۷ [6] معجم الادباء یاقوت ج ۵، ص ۱۵۰، ۱۵۸، یاقوت نے محاکمہ کیا کہ دونوں کا قول درست ہے، لیکن ابوالفرج کا قول زیادہ بہتر ہے۔

۱۰۱۰ء) سوق الوراقین میں اسی نوع کے مناظروں سے لطف اندوز ہوتے تھے، چنانچہ موصوف نے کتاب الامتاع والمؤانسۃ میں ایسے مناظروں کا تذکرہ کیا ہے،[1] قفطی نے لکھا ہے کہ بغداد میں ابن وداع ازدی المتوفی فی حدود ۲۳۰ھ کی دوکان ایسی تھی کہ اس میں عامۂ اہل ادب آکر بیٹھتے، مذاکرہ و مباحثہ کرتے، ان میں ایسی باتیں حاصل ہوتی تھیں جو دوسری ادبی مجالس میں حاصل نہیں ہوتی تھیں،[2] "ربہ" میں جو موصل و شام کے مابین ایک شہر ہے، سعد وراق کی ایسی ہی ایک دوکان تھی،[3] بعض نابینا اہل علم بھی بلا ناغہ روزانہ یہاں آتے تھے، چنانچہ ابوالغنائم حبشی بن محمد واسطی ضریر المتوفی ۵۶۵ھ بیس[4] برس تک بغداد کے سوق الوراقین میں برابر آتے رہے تھے،[5] ان ہی خوبیوں کی وجہ سے مورخین نے سوق الوراقین کو مجالس علماء و شعراء کا مرکز[6] اور اہل علم کا مستقر قرار دیا ہے۔[7]

سوق الوراقین میں ارباب فن تقویم کا عمل کرتے، اہل کمال کے جوہر کھلتے، باہم محبت بڑھتی تھی، چنانچہ ماہر نجوم و تقویم ابوالقاسم رضی مصاحب سیف الدولۃ حمدانی کا بیان ہے:

"میں عضد الدولۃ کے زمانہ میں بغداد آیا، علم نجوم کو خیرباد کہہ کر تجارت کرنے لگا، ایک دن سوق الوراقین سے گذر رہا تھا کہ ابوالقاسم تنصری المتوفی ۴۱۳ھ کو تقویم بناتے دیکھا تو کھڑے ہوکر اس کے عمل کو دیکھنے لگا، تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھاکر دیکھا اور کہا: کیا دیکھتے ہو، آگے بڑھو، یہ تمہارے سمجھنے کی چیز نہیں، مگر میں دیکھتا رہا، جب وہ فارغ ہوا تو میں نے عرض کیا: آپ نے دوہرا عمل کیا، دوہری ضربیں لگائیں، اگر اس طرح سے کیا ہوتا تو یہ زحمت نہ کرنی پڑتی، اور چلتا ہوا، تنصری میرے پیچھے دوڑا، آکر مجھ سے چمٹ گیا، سر کو چوما، معافی مانگی، نام پتہ پوچھا، شہرت کی بنا پر فوراً پہچان گیا اور مکان پر آکر مشکلات حل کرنے لگا۔"[8]

وراق اہل علم کی قدر کرتے، اگر ان میں کوئی خوبی دیکھتے تو کتاب نذر کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے،

[1] کتاب الامتاع والمؤانسۃ تحقیق احمد امین و احمد الزین بیروت: دار مکتبۃ الحیاۃ ب ت، ج ۲، ص ۱۱ و ۲۶ [2] انباہ الرواۃ للقفطی ج ۲، ص ۱۳۴ [3] معجم الادباء ج ۳ ص ۲۳ [4] ایضاً ص ۳۰ [5] نکت الہمیان للصفدی ص ۱۳۴ [6] مناقب بغداد لابن الجوزی، ص ۲۶ [7] الخطط المقریزیہ ج ۲، ص ۱۰۲ [8] انباہ الرواۃ للقفطی ص ۳۲۹-۳۳۰۔

عرب کا مشہور شاعر متنبی سوق الوراقین میں زیادہ بیٹھا اٹھتا تھا، اور اس کا علم ان ہی کتابوں کا رہین منت تھا،[1] اس نے کسی وراق کے پاس اصمعی کی تیس[3] ورق پر مشتمل کتاب دیکھی، لے کر پڑھنے لگا، جب دیر لگی تو وراق بولا: آپ کا مقصد اسے یاد کرنا ہے، یہ کام ایک مہینہ کے بعد کیجیے گا، متنبی نے کہا یہ یاد ہوگئی، کہنے لگا: پھر کتاب تمھاری ہے، وراق نے متنبی سے کتاب لی، اس نے پوری زبانی سنا دی، وراق نے کتاب متنبی کو دے دی، وہ آستین میں رکھ کر لے گیا۔[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل علم مسائل کی کمی کی وجہ سے سوق الوراقین میں نادر و اہم رسالے یاد کیا کرتے تھے، نیز اہل کمال کا علم سوق الوراقین کا رہین منت ہوتا تھا،

عہد عباسی میں کتب اور کتب خانہ سماجی زندگی کے لوازم سے سمجھا جاتا تھا، اس لیے کتابوں کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی، تجارت کتب کے مستقل اور عارضی مرکزوں کے اسلامی قلمرو میں بہتات تھی، ہر قسم کی کتابیں عام بازاروں میں فروخت ہوتی تھیں، کتابوں کا خاص بازار بھی تھا جس کو سوق الوراقین[4]، سوق الکتبیین[4] اور سوق الکتب[5] کہا جاتا تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوق الوراقین دراصل کاغذ سازی، کاغذ فروشی، اور سوق الکتبیین، سوق الکتب (کتب فروشی) کا بازار تھا، البتہ عرف عام میں ایک کا دوسرے پر اطلاق کیا جاتا تھا، اسی اعتبار سے اس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، جو لوگ سوق الکتب میں کتابیں فروخت کرتے تھے، انھیں کتبی کہا جاتا تھا، بہت سے اہل علم اس نسبت سے مشہور تھے، وراق کو بھی کتبی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اس لیے کہ وہ وراقت و کتب کا مشغلہ رکھتا تھا، چنانچہ کتبی اور ابن الکتبی سے وراق کی شہرت اس امر کی غماز ہے۔ تیسری صدی ہجری میں بعض شہر جیسے بغداد کا سوق الکتب جو باب البصرہ کے سامنے واقع تھا[6]، یہ بازار

---

[1] تاریخ بغداد ج ۴، ص ۱۰۳ [2] لسان المیزان ج ۱، ص ۱۶۰ [3] الفہرست لابن الندیم ص ۲۰۹، تاریخ بغداد ج ۱۱، ص ۳۹۹، الحضارۃ الاسلامیۃ لآدم متز ج ۱، ص ۲۶۹ [4] الخطط المقریزیہ ج ۲، ص ۱۰۲ [5] معجم البلدان ج ۳، ص ۱۳۹، الخطط المقریزیہ ج ۲، ص ۱۰۲، المقدمہ لابن خلدون ص ۷۵۵، خطط الشام لکرد علی ج ۶، ص ۱۹۵۔
[6] المدخل فی تاریخ الحضارۃ تالیف ناجی معروف بغداد، مطبعۃ العانی، ۱۳۷۹ھ ص ۱۸۰۔

سینکڑوں دکانوں پر پھیلا ہوا تھا، ان دکانوں پر کتابیں سب معیاری ملتی تھیں[1]، معلوم ہوتا ہے سوق الکتب مشاہیر کی کتابوں سے اٹا رہتا تھا، اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ ۳۰۹ھ میں جب منصور حلاج کو قتل کیا جانے لگا تو اس نے کہا تھا کہ میری کتابیں اہل السنۃ والجماعۃ کے مذہب پر سوق الکتب میں موجود ہیں،[2] یہ دکانیں چوک بازار میں کھولی جاتی تھیں، تاکہ ہر طرف سے آنے والے کاغذ با سانی خرید سکیں، چنانچہ ابو حفص خمارتاش بن عبداللہ کاغذی رومی المسمی بعمر المتوفی ۵۳۱ھ کی نیشاپور میں دکان چوک بازار میں واقع تھی[3]، یہ دکانیں بالعموم کسی مسجد کے قریب ہوتی اور کتابوں سے بھری رہتی تھیں[4]، اس لیے خریداروں کو کبھی مایوسی نہیں ہوتی تھی[5]، پھر سوق الکتب میں وراقوں کا عریف (expert) ہوتا تھا جس کی نظر سوق الکتب کے ذخائر پر رہتی تھی، وہ وراقوں اور خریداروں کی رہنمائی کرتا تھا، چنانچہ شرف الدین محاسن الصوری المتوفی ۶۶۳ھ قاہرہ کے سوق الکتب کے عریف تھے[6]۔

ان بازاروں اور دکانوں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے مقامات پر بھی کتب فروشوں کی دکانیں کھلی ہوتی تھیں[7]، وراق یہاں کتابیں بیچتے اور نقل بھی کرتے تھے، چنانچہ احمد بن جعفر وراق کی مشرقی بغداد میں خان ذیل میں اسی قسم کی دکان تھی، بعض وراق کتب خانوں میں کتابیں نقل کرتے اور اپنی دکان پر کتابیں بیچتے تھے[8]۔

عہد عباسی میں مشرقی و مغربی قلمرو کے دارالخلافہ اور مرکزی شہر کتابوں کی تجارت کی منڈیاں تھے، یہاں نہ صرف کتابیں، بلکہ پورے پورے کتب خانوں کی قیمت اچھی لگتی تھی، مغرب (یورپ) میں قرطبہ اور مشرق (ایشیا) میں بغداد کو اس امر میں شہرت خاص حاصل تھی، تنہا یہی فضیلت شہروں کی برتری کے ثبوت میں کافی

---

[1] مسلمانوں کی صنعت و حرفت، زراعت و تجارت از دران کریم، ترجمہ محمد جمیل الرحمن، الہ آباد، کتابستان ۱۹۳۴ء ص ۷۵۔
[2] تکملۃ تاریخ الطبری لمحمد بن عبدالملک الہمدانی تحقیق البرت یوسف کنعان ط: ۲ بیروت، المطبعۃ الکاثولیکیہ ۱۹۶۱ء، ص ۲۵، [3] التحبیر للسمعانی ج ۱ ص ۲۷۲ [4] مسلمانوں کی صنعت و حرفت ص ۷۵ [5] ایضاً [6] الذیل علی الروضتین لابی شامہ، ص ۲۳۶ [7] الفہرست لابن الندیم، ص ۱۴۱ (فلوگل) [8] معجم الادباء ج ۵، ص ۹۷۔

سمجھی جاتی تھی، چنانچہ مناظروں میں یہاں کے لوگ دوسرے شہر کے رہنے والوں کا یہی بات کہہ کر منہ بند کرتے، اور اپنی برتری کا اظہار کرتے تھے، ابو الفضل یفاشی کا بیان ہے:

"ایک مرتبہ معارف پرور سلطان مغرب المنصور یعقوب موحدی (۵۵۵ھ، ۵۹۵ھ یہ ۱۱۶۰ء، ۱۱۹۹ء) کے دربار میں [illegible]ھ میں مشہور فلسفی و فقیہ ابن رشد المتوفی ۵۹۵ھ اور حکیم ابو بکر محمد بن عبد الملک ابن زہر ایادی المتوفی ۵۹۵ھ میں اس موضوع پر مناظرہ ہوا، ابن رشد نے ابن زہر سے کہا: تم جو فضائل بتلاتے ہو میں یہ نہیں جانتا، بس ایک ہی بات جانتا ہوں کہ اگر کوئی عالم اشبیلیہ میں مرتا ہے تو اس کی کتابیں بکنے کے لیے قرطبہ آتی ہیں، یہاں ان کی قیمت اچھی ملتی ہے اور اگر کوئی گویا قرطبہ میں مرتا ہے تو اس کے گانے بجانے کے سامان کے دام وہاں اچھے ملتے ہیں، اور پھر کہا[1]:

قرطبة اکثر بلاد الله کتباً۔ — قرطبہ بلاد اسلامی میں کتابوں کی کثرت میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی قلمرو میں کتابوں کا شوق بڑھتے بڑھتے وجہ افتخار بن گیا تھا۔

بلاد مشرقی میں بھی جب کوئی مرتا اس کی کتابیں بغداد میں اچھی قیمت میں بکتی تھیں، چنانچہ ابو العباس جعفر بن احمد مروزی کی کتابیں ان کی وفات کے بعد ۲۷۵ھ میں اہواز سے فروخت کے لیے بغداد لائی گئیں، اور طاق حرانی میں فروخت کی گئی تھیں[2]۔

اس سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ ہر شہر میں کتابیں بکتی تھیں، لیکن مرکزی شہروں میں کتابوں کی قیمت زیادہ ملتی تھی، یہاں چونکہ کتابیں اور کتب خانے فروخت ہوتے تھے اس لیے شائقین کتب ان مرکزی شہروں کا بار بار سفر کرتے تھے، ابو نصر سہل بن مرزبان المتوفی تقریباً ۴۲۰ھ نے نفیس و نادر کتابوں کی جستجو میں بغداد کا بار بار سفر کیا تھا[3]، اس سے عوام و خواص میں کتابوں کے شوق کا اندازہ کیا

[1] نفح الطیب للمقری ج ۱ ص ۱۵۴ [2] الفہرست لابن الندیم ص ۲۱۴ – ۲۱۵ [3] یتیمۃ الدہر للثعالبی ج ۴ ص ۲۸۶۔

جا سکتا ہے[1]۔

رات میں کتب فروش سوق الوراقین میں دوکانیں اہل علم کو کرایہ پر دے کر تشنگان علوم کی پیاس بجھاتے، طلب و رسد کے سلسلہ کو پروان چڑھاتے، معاشرے کی علمی اقدار میں اضافہ کرنے کی سعی کرتے تھے، چنانچہ سوق الوراقین میں جاحظ کو رات بھر کے لیے دوکانیں کرایے پر دی جاتی تھیں[2]، سوق الوراقین میں نصابی کتابوں کی خرید فروخت سب سے زیادہ ہوتی تھی[3]۔

ہر علم و فن کی کتابیں اتنی بڑی تعداد میں سوق الوراقین میں موجود رہتی تھیں کہ اہل علم کو ہر وقت ان کی ضرورت کی کتابیں دستیاب ہوتی تھیں، جن کتابوں کی طلب زیادہ ہوتی ان کے نسخے بھی سوق الوراقین میں زیادہ پائے جاتے تھے، اور جن کتابوں کی مانگ کم ہوتی یا جن کی طرف اہل علم کی رغبت کم ہوتی تھی وہ کتابیں سوق الکتب میں کم ملتی تھیں[4]، بازار کتب میں لوگ عالموں اور کتابوں سے استفادہ کرنے کے بعد جو کتابیں اپنے مطلب کی پاتے ان کو خرید لیتے تھے، جن اہل علم کو اساتذۂ فن سے کتابوں کی سند حاصل نہیں ہوتی اور معاشرہ میں عالم و مصنف کے ردیف میں نمایاں ہونے کی خواہش چٹکیاں لیتی تھی، وہ سوق الوراقین سے کتابیں خرید کر اور ان کتابوں پر نامور علماء سے اپنی قرارت و سماعت کی نسبت کرکے روایت کرتے تھے[5]، یہ سوق الوراقین سے خریدی ہوئی کتابوں کو عام کرنے والے صحفی کہلاتے تھے، معاشرہ میں لفظ صحفی ان کی علمی حیثیت کا تعین کرنے اور ان کے سلسلۂ سند کو ناقابل اعتبار قرار دینے کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا، عجب حسن اتفاق ہے کہ صحافی اور صحافت کو آج بھی معاشرے میں تحقیق کا درجہ حاصل نہیں ہے۔

کتابوں کی نقل انفرادی و اجتماعی | عہد عباسی میں اگر کسی کو کسی مجلد والی کتاب درکار ہوتی تو اس کے اجزاء اور

[1] مسلمانوں کی صنعت و حرفت ص ۷۵، [2] الفہرست لابن الندیم ص ۱۶۹، معجم الادبا ج ۶، ص ۵۶ [3] المحدث الفاضل للرامہرمزی، ص ۲۱، تذکرۃ السامع والمتکلم لابن جماعہ ص ۱۶۴ [4] الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ لعلی بن عبد العزیز الجرجانی، تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم وعلی محمد البجاوی، القاہرۃ مطبعۃ عیسیٰ البابی الحلبی ۱۳۸۶ھ ص ۵۱ [5] تاریخ بغداد ج ۸ ص ۳۶۷۔

مجلدات مختلف وراقوں کو دے کر نقل کرائی جاتی تھی، اس طرح ضخیم سے ضخیم متعدد جلد والی کتاب بہت جلد اور کم سے کم مدت میں جلدی تیار ہو جاتی تھی، چنانچہ امین الدولہ ابو الحسن بن غزال نے ایک مرتبہ ابن عساکر کی تاریخ دمشق جو اسّی جلدوں میں تھی نقل کرانی چاہی تو اسے دس کاتبوں میں تقسیم کر دیا، ہر کاتب کے حصہ میں آٹھ جلدیں آئیں، اور انھوں نے دو برس میں پوری کتاب نقل کرالی تھی[1]

مصنف و وراق کی نقل میں فرق

عالم، مصنف اور وراق کی کتابت میں فرق تھا، وراق کمائی اور خوبصورتی کی خاطر کشادہ لکھتا، عالم و مصنف کم اوراق میں زیادہ لکھتا، جگہ کم گھیرتا اور کاغذ بھی احتیاط سے استعمال کرتا تھا، تاکہ خرچ کم ہو، وہ تھوڑے پیسوں میں زیادہ کتابیں نقل کرتا، تاکہ نقل و حمل اور سفر میں لے جانے میں سہولت ہو، اس کا لکھا ہوا وراق سے زیادہ مستند سمجھا جاتا تھا، چنانچہ ابو علی حسین ماسرجسی نے مسند ابی بکر دس جزوں سے کچھ زیادہ میں لکھی، اسے وراق نے ساٹھ جزوں سے بھی زیادہ میں نقل کیا تھا[2]

یہ سوق الوراقین سے پیدا ہونے والی خوبیاں تھیں جو علم و فن کو پھیلا رہی تھیں، لیکن کچھ لوگ اس میں ایسے بھی در آئے تھے جو تصنیف و تالیف کی قابل قدر صلاحیتیں رکھتے اور اچھی تصنیف و تالیف کرتے، مگر احساسِ کمتری یا نفع اندوزی کی خاطر وہ اپنی تحریریں کسی معروف مصنف کے نام سے فروخت کرنے لگے تو ماہرین کتابیات اور کتب شناسوں نے ایسے اصحاب کا کھوج لگایا، ان کو نمایاں کیا، تاکہ جعل سازی کی حوصلہ افزائی نہ ہو سکے، ابن الندیم نے اس جعل سازی کے تدارک کے لیے "الفہرست" میں ایسے اشخاص و کتب کی جا بجا نشاندہی کی ہے، اور یہ نشاندہی کتب خانوں میں کتابوں کے انتخاب میں بڑی مدد و معاون رہی۔

فن کتابیات کی تاریخ میں جعل سازی کی نشاندہی کا آغاز ابن الندیم نے کیا ہے، ان جعل سازیوں کے اظہار کے لیے وضع، اختلاق، انتحال وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے جاتے تھے، جعل سازی کی وجہ سے سوق الوراقین کے علمی وقار کو نقصان پہونچا جس کی یادگار اردو زبان میں ایک لفظ سوقیانہ ادب (بازار کے لائق) معرض وجود

---

[1] عیون الانباء لابن ابی اصیبعہ ج ۳ ص ۳۸۶ [2] تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۳ ص ۹۵۶ -

میں آیا، جو ان ہی جعل سازوں کے فن کا نتیجہ ہے۔

دور عباسی میں وراق اور کتب فروش بھی اہل علم کو مستعار بلا منفعت کتابیں مہیا کرتے تھے، چنانچہ ایک وراق نے ابن جریر طبری کو صرف قیاس کے موضوع پر چالیس[1] سے کچھ کم کتابیں مستعار مہیا کی تھیں[2]

فروخت کتب کے مستقل و عارضی مرکز

سوق الوراقین کتابوں کی خرید و فروخت کے مستقل مرکز تھے، کتابوں کی خرید و فروخت کے عارضی مرکز وہ وقتی مقامات تھے جہاں کسی مجبوری کے تحت کتابوں کا ذخیرہ فوری طور پر بیچا جاتا تھا، جیسے علماء کے مکانات جہاں مرنے کے بعد ان کی کتابیں اور ان کا کتب خانہ بکتا تھا، کوفہ میں ابن الاعرابی کا کتب خانہ ان ہی کے مکان پر ابو جعفر تحطبی نے خریدا تھا[2]، کبھی کسی خاص مقام پر مقررہ دنوں میں فروخت کی جاتی تھیں، چنانچہ ابو الفتوح ناصر بن علی انصاری المعروف بابن صورہ المتوفی ۶۰۷ھ اپنے مکان کے دروازہ کی دہلیز پر بیٹھا کرتا اور دوشنبہ اور چہارشنبہ کو علماء و روؤسا آتے، اور اپنی پسند کی کتابیں خرید کر لے جاتے تھے[3]، اجزاء اور مجلدات جب ذخیرۂ کتب میں رل مل جاتیں تو جو کتابیں ناقص ہو جاتی تھیں انھیں تلاش کر کے پورا کرتے تھے، موصوف فروخت کتب میں پورے اجزاء اور مجلدات کا اہتمام کرتے تھے، اس لیے ہفتہ میں دو دن فروخت کرتے تھے[4]

وزراء، امراء، روؤسا اور وہ لوگ جو اپنے کاروبار یا علمی کاموں میں انہماک کی وجہ سے سوق الکتب نہیں جا سکتے تھے یا کم جاتے تھے وہ دلالوں کی معرفت جنھیں "دلال الکتب" اور "سمسار" کہا جاتا تھا، کتابیں منگاتے[5] اور خریدا کرتے تھے[6]

بعض اوقات نایاب کتابوں کی جستجو کے لیے جہاں گشت ادبار کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں چنانچہ

---

[1] معجم الادباء ج ۶، ص ۴۵۳ [2] ایضاً، [3] ابن خلکان ج ۱، ص ۶۳، [4] الذیل علی الروضتین لابی شامہ ج ۱، ص ۶۲۸، کتاب السلوک للمقریزی ج ۱، ص ۳۷۷، النجوم الزاہرۃ لابن تغری بردی ج ۶، ص ۳۳۲ -

[5] الخطط المقریزیہ ج ۲ ص ۳۶۷، [6] معجم الادباء ج ۵ ص ۴۸۴، اعلام النبلاء بتاریخ حلب الشہباء تالیف محمد راغب الطباخ، حلب المطبعۃ العلمیہ ۱۳۴۳ھ ج ۴، ص ۴۲۱ -

قاضی فاضل نے وزیر ابو نصر احمد بن یوسف منازی المتوفی ۴۳۷ھ کے دیوان کو جو بہت نایاب تھا، "بعض الادباء السفاء" چند جہاں گشت ادیبوں کو مامور کیا تھا، لیکن وہ بھی اس کے حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد عباسی میں نایاب کتب کو حاصل کرنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کی جاتی تھیں[1] بادشاہوں اور وزیروں کے گماشتے حصول کتب کی خاطر اسلامی قلمرو کے مشرقی و مغربی شہروں میں سفر کرتے رہتے تھے[2]

عہد عباسی میں مصنف یا اہل علم امراء اور قدردانوں کے یہاں کتاب پہونچاتے تو اس کی قیمت کچھ نہیں ہوتی تھی، کتاب ان کی طرف سے ہدیہ اور دینار ان کی جانب سے عطیہ ہوتے تھے، اس طرح امراء اہل علم کی قدر و ہمت افزائی کرکے کتابیں حاصل کرتے تھے، چنانچہ محمد بن عبد الملک زیات کو جاحظ نے کتاب الحیوان کا نسخہ پیش کیا تو اس نے پانچ ہزار دینار اس کو دیے تھے، اور جب ابن ابی داؤد کو کتاب البیان والتبیین کا نسخہ دیا تو اس نے بھی جاحظ کو پانچ ہزار دینار دیے، جب اس نے ابراہیم بن عباس کو کتاب الزرع والنخل کا نسخہ پیش کیا تو اس نے اس کو پانچ ہزار دینار عطا کیے تھے[3]

عہد عباسی میں ذخائر کتب میں اضافہ کے تین اہم ذرائع

عہد عباسی میں عموماً ذخائر کتب میں تین اہم ذرائع سے اضافہ کیا جاتا تھا:

(ا) حسب ضرورت وقتاً فوقتاً کتابیں سوق الوراقین سے خریدی جاتی تھیں۔

(ب) کتب خانہ میں کاتب وراق کتابت پر مامور کیے جاتے جو شب و روز لکھتے رہتے اور کتابوں میں اضافہ کرتے رہتے تھے، جیسا کہ واقدی کا معمول تھا (ج) اساتذہ اپنے تلامذہ کو کئی بار نئی کتابیں املا کرا کر کتابوں کی نشر و اشاعت کرتے، تازہ و نظر ثانی شدہ اڈیشن ذخائر کتب میں اضافہ کرتے رہتے تھے، چنانچہ ابو عبد اللہ محمد بن زیاد اعرابی (۱۵۰-۲۲۵ھ) کی مجلس درس کے متعلق ابو العباس ثعلب کا بیان ہے "اس کی مجلس املا و درس میں بیک وقت سو طلبہ شرکت کرتے تھے، اور وہ ان اہل علم کو کئی بار نئی علم لکھواتے تھے[4]" (باقی)

[1] الوافی بالوفیات للصفدی ج ۸ ص ۲۸۵ [2] الحلۃ السیراء لابن الآبار طبع مصر ۱۹۵۵ء ج ۱ ص ۲۰۲، تاریخ ابن خلدون ج ۴ ص ۳۱۷، نفح الطیب للمقری ج ۱ ص ۲۶۲ [3] معجم الادباء ج ۶ ص ۷۶ [4] الفہرست لابن الندیم ص ۱۰۳۔

مطبوعات جدیدہ

معرکۂ سنت و بدعت:۔ مرتبہ جناب محمد اشفاق حسین صاحب متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۳۲۰، قیمت پندرہ روپیے، پتے:۔ (۱) مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد، ۱ (۲) کوثر ایجنسی چھتہ بازار حیدرآباد ۲ (۳) مکتبہ تجلی دیوبند (یوپی)

جس طرح ایک مسلمان کے لیے اتباع سنت لازمی ہے اسی طرح اجتناب بدعت بھی ضروری ہے، یہ کتاب اسی مقصد سے لکھی گئی ہے اور اس میں سنت کی اہمیت واضح کی گئی ہے اور بدعتوں کی تردید کی گئی ہے یہ پندرہ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے بدعت اور تحریف دین کی مذمت اور مانعین بدعت کی فضیلت قرآن مجید اور احادیث سے واضح کی ہے، اور مختلف حیثیتوں سے بدعات کے نقصانات دکھائے ہیں، نیز ان کے فروغ و اشاعت کے اسباب تحریر کیے ہیں، پھر دو ابواب میں کتاب و سنت اور آثار صحابہ کے اتباع کی اہمیت بیان کی ہے، اور ایک باب میں اجماع اور سواد اعظم کا مطلب بیان کیا ہے، اور اس پر زور دیا ہے کہ سواد اعظم سے عوام کی کثرت کے بجائے اہل علم کی کثرت مراد ہے، ایک باب میں بدعت و اجتہاد کا فرق دکھا کر اہل بدعت کے نقطۂ نظر کی تردید کی ہے، ایک باب بدعت کی حقیقت اور اس کی تعریف و توضیح پر مشتمل ہے، اس کتاب میں جا بجا بدعت کی حسنہ و سیئہ کی تقسیم کو غلط ثابت کیا ہے، اور دکھایا ہے کہ اس کا خواہ کوئی بھی نام دیا جائے دین میں اس کی کوئی گنجائش نہیں، لائق مصنف نے بدعت حسنہ کو باطل ثابت کرنے کے لیے احادیث و آثار صحابہ کے علاوہ بکثرت ائمہ متقدمین اور کبار علماء کے اقوال نقل کیے ہیں، رد بدعت میں یہ

ایک مفید کتاب ہے، جو لایق مطالعہ ہے، لیکن اس کی ترتیب اور زبان و بیان میں کسی قدر ناہمواری ہے اور کہیں کہیں تکرار اور غیر ضروری طوالت بھی ہے، مصنف کو مناظرانہ انداز سے پرہیز کرنا اور مباحث کو سمیٹ کر لکھنا چاہیے تھا۔

عورت :۔ مرتبہ مولانا افتخار فریدی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۱۶، مجلد، قیمت ۲۵ روپیے، ناشر عرشی پبلیکیشنز انڈیا ۱۲۰۵ رکاب گنج، آصف علی روڈ، نئی دہلی۔

مولانا افتخار فریدی کو دعوت و تبلیغ کے کام سے بڑی دلچسپی اور فطری مناسبت ہے، اس لیے وہ مسلمانوں کی اصلاح اور دین کی اشاعت کے لیے برابر فکر مند رہتے ہیں، اور اس غرض سے مفید دینی و تبلیغی کتابیں اور رسالے بھی شایع کرتے رہتے ہیں، ابھی تک ان کی توجہ مردوں کی جانب زیادہ مبذول تھی، اب انھوں نے عورتوں کی اصلاح و ہدایت کی جانب بھی توجہ کی ہے، اور یہ مفید کتاب شایع کی ہے، جس کی حیثیت کشکول جیسی ہے، اس میں عورتوں کے تعلق سے گوناگوں مفید اور ضروری باتوں کا تذکرہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے بارہ میں اسلامی اور جاہلی نقطۂ نظر کیا ہے؟ اسلام سے پہلے اس کی کیا حیثیت تھی؟ اور اسلام نے اسے کیا درجہ دیا ہے، ہندو سماج اور بعض دوسرے مذاہب میں اس کی کیا حیثیت ہے؟ اور اس کے بارہ میں موجودہ مغربی نظریات کیا ہیں؟ مصنف کا اصل مقصد عورت کے بارہ میں اسلامی تعلیم و ہدایت کو پیش کرنا ہے، اس لیے انھوں نے ان حقوق و فرایض کی زیادہ وضاحت کی ہے جو اسلام نے اس کو دیے اور بتائے ہیں، انھوں نے عورتوں کی چار حیثیتوں ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کا ذکر کرکے بھی ان کے مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے، اور ان کے مذہبی و معاشرتی مسائل اور پردہ وغیرہ پر اچھی گفتگو کی ہے، گذشتہ اور موجودہ دور کی متعدد ایسی خواتین کا بھی تذکرہ کیا ہے جو علمی و عملی حیثیت سے بہت ممتاز تھیں، اس سلسلہ میں جنگ و جہاد اور اشاعت اسلام میں ان کے کارنامے، علمی و دینی خدمات اور نمایاں دینی و اخلاقی خصوصیات بیان کی ہیں، مصنف نے متعدد اہل علم اور اصحاب قلم کی مفید تحریریں اور

شعراء کی موثر نظمیں بھی جمع کردی گئی ہیں، جن کا مطالعہ ہر مسلمان خاتون کے لیے مفید ہوگا، انھوں نے حسبۃً للہ یہ کتاب لکھی ہے اس لیے اس میں ربط، تسلسل اور ترتیب وغیرہ کا زیادہ خیال نہیں رکھا ہے۔

تذکرۂ طیبؒ :۔ مرتبہ مولوی ابوبکر غازیپوری، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۷۰، قیمت ۲۵ روپیے، پتہ :۔ المکتبۃ الاثریۃ قاسمی منزل، سید واڑہ غازی پور (یوپی)

یہ کتاب مولانا قاری محمد طیبؒ مرحوم مہتمم دارالعلوم دیوبند پر متعدد اصحاب کے مضامین اور تحریروں کا مجموعہ ہے، شروع میں ممتاز علماء مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ اور مولانا محمد منظور نعمانی وغیرہ کی تاثراتی تحریریں درج ہیں، پھر ان کے حالات و سوانح، فضل و کمال، سیرت و شخصیت اور خدمات و کارناموں پر مشتمل مضامین پیش کیے گئے ہیں، شعراء کا منظوم خراج عقیدت اور اخبار و رسائل کے اداریے بھی دیے گئے ہیں لیکن معارف کا اداریہ پتہ نہیں کیوں نظر انداز کردیا گیا ہے، مولانا محمد طیب صاحبؒ کی شخصیت گوناگوں خوبیوں کی جامع تھی، اس تذکرہ میں ان کی سیرت و شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے، بعض مضامین میں ان کی تصنیفات اور شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے، اور بعض میں ان کی تقریروں کی دلنشینی اور خطابت میں غیر معمولی کمال کا ذکر ہے، اس کا بھی تذکرہ ہے کہ ان کے دور میں دارالعلوم دیوبند ترقی کے بام عروج پر پہونچ گیا، مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا مضمون لایق مطالعہ ہے، انھوں نے دارالعلوم کے فکر و مسلک کے تحفظ و اشاعت کے لیے مولانا محمد طیبؒ کی غیر معمولی جدوجہد کا تذکرہ کیا ہے، مولانا محمد طیبؒ اور دارالعلوم دیوبند میں گوشت و ناخن جیسا تعلق تھا، بعض مضامین میں ان کی اس سے جدائی کا المناک ذکر بھی آگیا ہے، لیکن اس کی جو توجیہ کی گئی ہے وہ ایک دوسرے سے مختلف ہے، چنانچہ بعض مضمون نگاروں نے خود مہتمم صاحبؒ ہی پر اس کی ذمہ داری عاید کی ہے، اور بعض نے ان کے متعلقین اور قریبی اشخاص کو اور بعض نے ان کے مخالفین کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے، اس کتاب کو مولانا محمد طیب کے شایان شان تو نہیں کہا جاسکتا، اور نہ یہ ان کی مستقل سوانح عمری ہے، بعض مضامین بھی فرد تر اور زبان و بیان کی حیثیت سے کم درجہ کے ہیں، تاہم لایق مرتب نے اسے محنت اور

دلچسپی سے مرتب کیا ہے، اور اس کے لیے وہ حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔

مضامین وحشتؔ:۔ مرتبہ جناب جمال احمد صدیقی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۴۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۷ روپیے، پتہ: مغربی بنگال اردو اکاڈمی ۱۷ اسٹری موہن ایونیو کلکتہ ۱۴۔

جناب رضا علی وحشتؔ مرحوم کلکتہ کے مشہور ادیب و شاعر تھے، ان کے قلم کی روانی نظم و نثر دونوں میں یکساں تھی، انھوں نے مشق سخن کے ساتھ بہت سے ادبی و تنقیدی مضامین بھی لکھے تھے، زیر نظر کتاب ان کے چھوٹے بڑے پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے، پہلے اردو کے قدیم شاعر ولیؔ گجراتی کی شاعری پر سیر حاصل مضمون ہے، اس کے بعد شیخ علی حزیںؔ پر مبسوط مضمون ہے، ان دونوں میں ان شعراء کے کلام کا جائزہ لے کر ان کے لفظی و معنوی محاسن دکھائے ہیں کہیں کہیں دوسرے شعراء سے ان کا موازنہ بھی کیا ہے، اور شیخ علی حزیںؔ کے مختصر حالات بھی تحریر کیے ہیں، اور مختلف عنوانات کے تحت ان کے کلام کا انتخاب بھی دیا ہے، ایک مضمون میں پنجاب کے فارسی گو شاعر غنیمتؔ کی قادر الکلامی دکھائی ہے، چند مضامین میں اردو غزل میں اصلاح کی ضرورت واضح کی ہے، اس سلسلہ میں مولانا حالیؔ مرحوم کی اصلاحی کوششوں کا ذکر بھی کیا ہے، اور ایک مستقل مضمون میں ان کی غزل گوئی پر اظہار خیال کیا ہے، جناب عندلیبؔ شادانی کے نام ان کا ایک طویل مکتوب بھی درج ہے، جس میں شعر و ادب کے دلچسپ نکتے بیان کیے ہیں، دوسرے مضامین میں بنگال کی اردو خدمات کا اجمالی جائزہ اور چند بنگالی شعراء کے خصوصیات کلام پر بحث کی ہے، ان مضامین میں اہل بنگال کی اردو بیزاری کا گلہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے: "یہ وہی بنگالہ تھا جو بلا تفریق مذہب و ملت اردو کی خدمت کرتا تھا، یا اب وہی بنگالہ ہے کہ ایک مسلمان کے اردو بولنے پر کوئی غیر مسلم نہیں بلکہ ایک مسلمان اپنے تیور بدل لیتا ہے، اور اردو بولنے والے کو نفرت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے، وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اردو بولنے والوں کو ہر قسم کا نقصان پہونچانا اپنا قومی و ملکی فرض سمجھتا ہے ع تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو"! افسوس کہ بنگال کے لوگوں نے اپنے اس مایۂ ناز فرد کی دردمندانہ شکایت کا کوئی اثر قبول نہ کیا بلکہ ان کے رویہ میں مزید شدت پیدا ہو گئی ہے، جس کا وقتاً فوقتاً مظاہرہ بھی ہوتا رہتا ہے، یہ مضامین بہت پہلے لکھے گئے تھے، اب نئے رجحانات نے شعر و ادب اور تنقید کے دائرہ میں بڑی وسعت پیدا کر دی ہے، لیکن خالص ادب کی تر و تازگی میں فرق نہیں آتا، اس لحاظ سے اس گلدستۂ ادب کی اشاعت پر مغربی بنگال اردو اکاڈمی تحسین کی مستحق ہے۔

"ض"

جلد ۱۳۶ ماہ محرم الحرام ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۸۵ء عدد ۴

مضامین

مقالات

آثار علمیہ

باب التقریظ والانتقاد